منظور تسکین

منظور تسکین

کھگول (داناپور)

پٹنہ

ج

نقش اوّل :- ایک ہزار

سالِ اشاعت :- ۱۹۷۵ء

قیمت :-

خوشنویس :- سوز داناپوری

مطبع :- لیبل لیتھو پریس، پٹنہ ۴

ناشر
منظور تسکین
کُنج ۲۲۰ سی، ڈی
شاردا اسٹریٹ، نیو کالونی کھگول

ملنے کے پتے

(۱) تاج اِسٹور، کھگول بازار۔ ڈاکخانہ کھگول (پٹنہ)

(۲) گُنجن نمبر ۲۲ سی ڈی نیو کالونی، ڈاکخانہ کھگول (پٹنہ)

(۳) بُک اِمپوریم - سبزی باغ پٹنہ ۴

دنیا کو جیسے دیتا ہو اِک دعوتِ نظر
وہ گُل جو آج باعثِ رشکِ چمن ہوا
(تسکین)

ملنے کے پتے

(۱) تاج اسٹور، کھگول بازار، ڈاکخانہ کھگول (پٹنہ)

(۲) گنجنہ ۲۲ سی ڈی نیو کالونی، ڈاکخانہ کھگول (پٹنہ)

(۳) بک امپوریم - سبزی باغ پٹنہ ۴

دنیا کو جیسے دیتا ہو اِک دعوتِ نظر
وہ گُل جو آج باعثِ رشکِ چمن ہوا

(تسکین)

۷۸۶
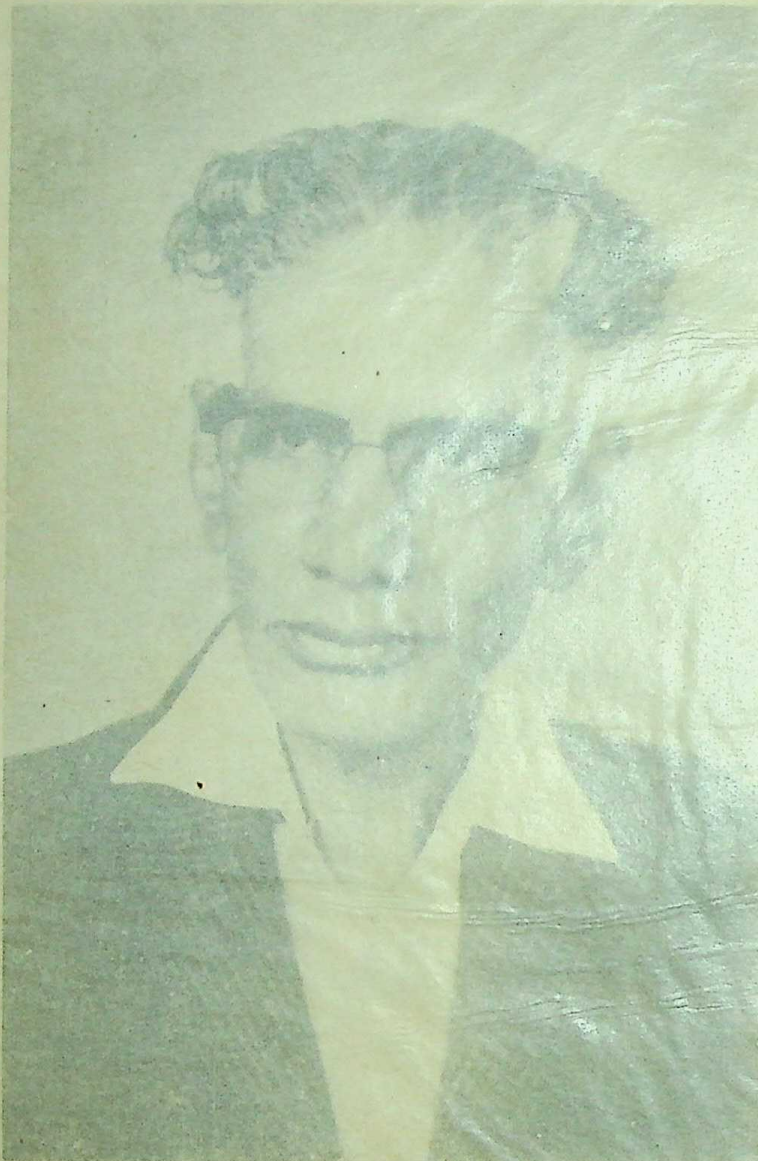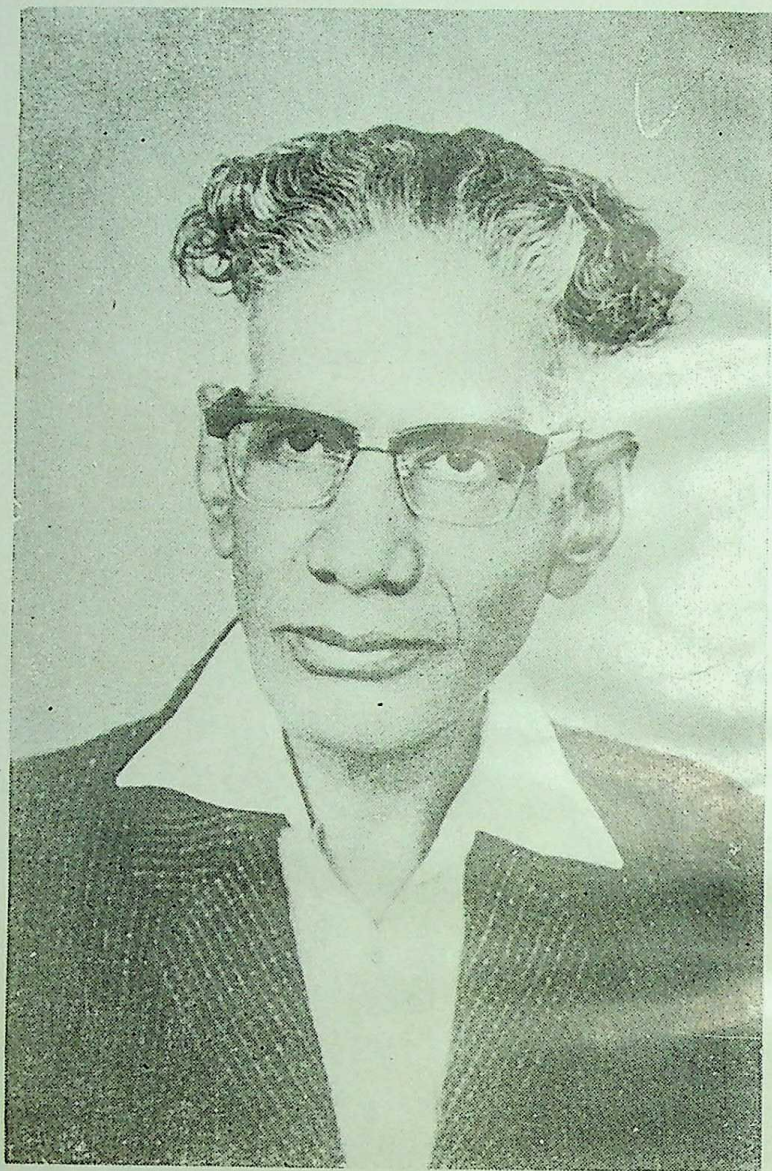
تقریظ

تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے کہ حضرت علامہ قتیل داناپوری کے تلامذہ نے "بزم احباب داناپور" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ "بزمِ احباب" کے ماہانہ طرحی مشاعرے بڑی پابندی کے ساتھ دس پندرہ برس تک منعقد ہوتے رہے۔ ابتداً یہ مشاعرے بی بی صالحہ خانم کے امام باڑے اور پھر جناب چندر شیکھر پرشاد ایڈووکیٹ متخلص بہ تیچھر داناپوری کے دولت کدہ پر منعقد ہوا کئے۔ مگر ایک عرصہ کے بعد یہ محفلِ شعر وسخن آستانۂ چشتیہ نظامیہ داناپور کے وسیع سماع خانہ میں برپا ہونے لگی۔ اِن مشاعروں کی اہمیت و زینت شعرائے عظیم آباد، پھلواری شریف اور شعرائے کھگول کی شرکتوں سے دہ چند ہو گئیں۔

جناب منظور الحق تسکین کھگولوی کو پہلی بار میں نے بزم احباب کے مشاعرے سے ہی جانا اور پہچانا۔ میری سخن فہمی و شعر گوئی کی ابتدا تھی۔ میں جناب تسکین کے ترنم سے محظوظ ہوتا اور ان کے اشعار اکثر گنگناتا رہتا تھا۔

جناب تسکین مولوی عبدالشکور صاحب مرحوم و مغفور کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ ۱۲ اگست ۱۹۲۱ء کو پیدا ہوئے۔ اُردو، فارسی اور عربی کی اِبتدائی تعلیم کھگول کے ایک مقامی مدرسہ میں حاصل کی اور مسلم ہائی اسکول پٹنہ سے ۱۹۴۱ء میں میٹرک پاس کیا۔ آپ کو شعر وسخن کا ذوق شروع سے ہی

رہا۔ اپنی پہلی غزل پر علامہ تمنّا عمادی مجیبی پھلواروی سے اصلاح لی۔ ان کے ترکِ وطن کے بعد ۱۹۵۲ء میں حضرت حمید عظیم آبادی مرحوم، تلمیذ حضرت شاد عظیم آبادی کے دامنِ تلمّذ سے وابستہ ہوئے۔ جناب تسکین کو نام و نمود اور شہرت کی طلب کبھی نہ رہی۔ وہ چھپنے چھپانے سے پرہیز کرتے رہے۔ تاہم آپ کی کتنی ہی غزلیں اور نظمیں ملک کے مقتدر رسائل و جرائد کی زینت بنیں۔

تسکین کی شاعری کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔ اس کے کیف و نشاط سے کم اور درد و غم سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اِن کے اکثر اشعار میں کرب و الم کی جو بجلیاں سی چمک جاتی ہیں، وہ ان کی ازدواجی زندگی کی ناآسودگی کا انعکاس ہیں۔ حقائق زندگی کو جھیلنے میں شاعر کی معاشی حیثیت بھی معاون ہوتی ہے اور اس کی فکر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تسکین اپنی کمزور معاشی حیثیت کے ساتھ ان سے نبرد آزما رہے۔ ہمارے سماج میں ایک کلرک کی زندگی قابلِ رحم ہے، یہ اور بات ہے کہ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا: ع

کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

بہر کیف! تسکین کی غزلوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُردو کی روایتی و کلاسیکی شاعری سے قریب رہے ہیں۔ لفظوں کے ہیر پھیر سے مضمون پیدا کرتے ہیں اور مسلّماتِ شاعری کے استعمال سے اپنی غزلوں کو رنگ و روغن بخشتے ہیں۔

بیسویں صدی میں اُردو شاعری کن تحریکوں سے متاثر ہوئی اور اس باغ میں کِس کِس چمن سے ہو کر نسیم پہنچی ہے۔ اس کی بھی اُنہیں خبر ہو گی مگر وہ اپنے ہی گلشن کی رنگینیٔ گل و شیرینیٔ بلبل کے دلدادہ ہیں۔ اُنہوں نے اسی میدان میں ریاض کیا ہے اور بلاشبہہ نئے نئے پھول کھلائے ہیں۔ اُردو شاعری

میں مسلّمات کی بڑی اہمیت ہے۔ گُل و بلبل، خزاں و بہار، ہجر و وصال، شمع و پروانہ، گلچیں و باغباں، شام و سحر، رُخ و گیسو، گلشن و زنداں، دیر و کعبہ، شیخ و برہمن، جام و مینا اور اسی طرح بیشمار اصطلاحات ہیں، جن سے اُردو و فارسی شاعری عبارت ہے۔ اپنے دامن میں ایک جہانِ معنی لئے ہوئے ہیں۔ یہ شاعر کے تازہ کار تخیّل اس کی ہوشمندی اور فن کارانہ چابکدستی پر منحصر ہے کہ وہ ان ہی بظاہر فرسودہ الفاظ کے دامن سے نئے مضامین حاصل کرے اور ان ہی کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار بھی۔ جناب تسکین اس کوشش میں ایک حد تک کامیاب رہے ہیں، جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ادیب شاعر خود کو اپنے ماحول اور اپنی عصری تحریکات سے بے نیاز نہیں رکھ سکتا اور اس کے رشحاتِ قلم اس کے محسوسات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ تسکین کے کلام میں آپ جگہ جگہ ان حقائق کی عکاسی پائیں گے: ؎

تسکیںؔ کی شاعری تو ہے منت پذیرِ فن
جوہر کھُلیں گے شعر کے نقد و نظر کے بعد

ان کے شعروں میں ان کی حُزنیہ لَے ایک خاص توانائی کے ساتھ اُبھرتی ہے:

جھونکے تھے غم کے باغ میں طوفان کی طرح
سنبل صفت تھے ہم کبھی ریحان کی طرح

سینے میں اِک چُبھن جو ہے آپ کے غم کا فیض ہے
پاتے ہی لذتِ خلش، خود کو اہم سمجھ لیا

آلام و مصائب ہوئے تسکینؔ کے ضامن
پھر کیوں نہ ہوں مجھ کو وہی لمحاتِ سزا یاد

تسکین کا دل رنج و الم کا خوگر ہے، شائد اسی لئے ان کی مشکلیں آسان ہوتی گئیں اور اب تو یہ عالم ہے کہ :

کیف ساماں خود ہی تسکین اضطرابِ دل ہوا
میں ہوں شیدائی اُسی کا جو مجھے تڑپائے ہے

یہ ضرور ہے کہ تسکین کی مشقِ سخن نے ان کے قلم کو ایک مخصوص روانی عطا کی ہے اور وہ جو بھی اور جیسا بھی کہنا چاہیں بڑی بے تکلفی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ یہ رواں دواں اندازِ قلم فطری محاسن بھی بکھیرتا جاتا ہے، مضمون آفرینی و نزاکتِ خیال کی آمیزش بھی نظر آجاتی ہے۔

مژگاں پہ آ کے اشک کے قطرے جو رُک گئے
ان کو بھی تیرے جلووں کا ہے انتظار کیا

معنوی و محاکاتی حُسن تو ہے ہی، صوتی کیف، لب و لہجہ، برجستگی اور زبان کی صفائی دیکھئے :

پایا شبِ فراق ستاروں سے تابناک
میں نے ہر ایک لمحہ ترے انتظار کا

عکسِ جمالِ یار تھا ہر شئے سے آشکار
دل کو بقدرِ ذوق میں بہلا کے رہ گیا

جلوۂ جاناں کچھ ایسا رنگ دکھلانے لگا
میں بھی دانستہ فریبِ حوصلہ کھانے لگا

اِس شعر میں جناب تسکین کا شاعرانہ تیور ملاحظہ ہو :

اللہ رے اضطراب کا عالم شب فراق
کچھ ہم ہی جانتے ہیں جو ہوگا سحر کے بعد

مگر شاعری کے کچھ اور بھی تقاضے ہیں، فکر و احساس کی تازگی، تجربات و مشاہدات کا تنوع، جذبات کا سوز، دل کا گداز، قلب کی انتہائی کیفیت ماحول کی ترجمانی، تشبیہ و استعارات کی ندرت وغیرہ۔

تسکین، اس راز سے واقف ہیں اور جب کبھی وہ اس طرف راغب ہوئے، اِن کے شبستانِ فن میں جگنو سے چمک اٹھتے ہیں : ؎

ایسے نسیمِ یاس کے جھونکے ہیں ہر طرف
مشکل ہے کوئی شمع تمنّا جلا سکے

روتے ہیں عمرِ رفتہ کی رنگینیوں کو ہم
کس سمت کو گئیں کہ انہیں پھر نہ پا سکے

تسکین زود گو ہیں، انہوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں اور قطعات و رباعیات بھی موزوں کی ہیں، مگر وہ غزل کے مردِ میدان ہیں۔

جناب تسکین میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں، جو مسافرِ جادۂ ادب کے لئے زادِ راہ سمجھی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اِن کا یہ شعری مجموعہ مستحسن نظروں سے دیکھا جائے گا۔

(ڈاکٹر) طلحہ رضوی برق ایم۔اے (ڈبل)
ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ (اردو اور فارسی)
جین کالج، آرہ

۷۸۶

پیشِ لفظ

اِدھر پندرہ برسوں میں اُردو شاعری کا مزاج جس تیزی سے بدلا ہے، اِسے ذہن میں رکھئے، تو ایسے شاعروں کے کلام پر کچھ لکھنا جو سختی سے روایت کے پابند ہیں، بڑے امتحان کا مرحلہ ہے۔ پیکر سازی کے وہ نئے عوامل جنہیں شعریات میں آج بڑی جگہ دی جا رہی ہے۔ اُن کے ہاں خال خال ہونگے، مختلف النوع اشیاء میں نئے انداز سے یگانگت کا کوئی پہلو نکالنا ان کے لئے فعلِ عبث ہوگا۔ نئی علامتیں اُن کے لئے بے معنی ہوں گی اور وہ ابہام اور پیچیدگی جو کلام کو قدرے لاینحل بنا کر ذہنوں کو کرید کی سمت رواں دواں کر دیتی ہے، ان کے لئے بے کیف ہوگی ــــ دراصل نئی شاعری کے یہ امتیازات کسی شاعر کے انفرادی تخلیقی رویہ سے وابستہ ہیں اس لئے کہ شاعری اجتماعی احساسات کو بیدار تو کر سکتی ہے لیکن اس کی تخلیق میں اجتماع کا کوئی کام نہیں۔ یعنی ایسے مشترکہ احساسات و جذبات ایسے کنائے، ایسی تشبیہیں جو سال خوردہ ہیں اور جو استعمال ہوتے ہوتے محاورے کی صف میں چلی گئی ہیں، کسی شاعر کی انفرادیت کی نمو میں سدِ راہ بن جاتی ہیں۔ اکثر روایت پسند اور تمام روایت پرست شعراء، شاعر کے انفرادی منصب کو نہیں پہچانتے۔ اِس لئے ان کے کلام میں اُکتا دینے والی عمومیت ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو محاورے سے حظ اُٹھالیں، شرط یہ ہے کہ آپ کے اندر محاورے اور شعر ہی فرق کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔

نئے شعر کے لوازم جناب تسکین کے کلام میں تلاش کرنا لایعنی بات ہوگی، اِن کے کلام سے محظوظ ہونے کے لئے اُسی روایت کا پاس رکھنا پڑیگا۔ جس میں گل وبلبل، شمع وپروانہ، ساقی ومیخانہ، رند ومحتسب، کفر وایمان، رقیب ومحبوب، جیسے کتنے ہی بندھے ٹکے شاعرانہ تراکیب وموضوعات ہیں۔ جناب تسکین ان سے بچنا نہیں چاہتے۔ بلکہ اپنی شاعری کی عمارت اِن ہی بنیادوں پر کھڑی کرتے ہیں۔ میں نے حضرت مہجور شمسی (جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے سخت جذباتی جھٹکے سے گذرنا پڑ رہا ہے) کے مجموعۂ کلام "نوائے راز" کا پیش لفظ لکھتے ہوئے روایتی شاعری کے ضمن میں جو بات کہی تھی اسی کا اعادہ جناب تسکین کی شاعری کے باب میں کرنا چاہوں گا۔ کچھ روایت سے وابستہ شعراء ایسے ہیں جنہیں ہر قدم پر احساس ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں، وہ بھی متعینہ راہ سے نہیں ہٹتے۔ لیکن جس راہ پر وہ گامزن ہوتے ہیں اُس کے حُسن وقبح سے آگاہ ہوتے ہیں۔ روایت کے وضع کردہ اقدار ومعیار انہیں عزیز ہوتے ہیں، وہ اپنے حوصلے کے مطابق اپنے احساسات وجذبات کو ان تسلیم شدہ اقدار ومعیار سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ہر قدم پر احساس ہوتا ہے کہ روایت تو بنتے بنتے بنتی ہے اور اقدار ومعیار کی سرحدیں چھُوتے ہوئے اسے خاصا وقت لگتا ہے۔ ایسے میں وہ انحراف کرنے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتے اور شاید اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ جناب تسکین جس شعری روایت سے وابستہ ہیں۔ اس کے حُسن سے نہ صرف آگاہ ہیں، بلکہ اُسے مستحسن بھی جانتے ہیں۔ انہیں اساتذہ کے بنائے ہوئے اقدار ومعیار پر کامل اعتماد ہے۔ لہٰذا وہ اپنے احساسات وجذبات کو اساتذہ کے تسلیم شدہ اقدار ومعیار سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں آپ جدید نہ کہئے انہیں اس کی پروا بھی نہیں، غالباً ان کا اصرار ہوگا کہ انہیں روایتی شعراء کی صف میں رکھ کر دیکھا جائے۔ نئے اوزان ومعیار پسِ پشت ڈال دیئے جائیں۔

پُرانی شاعری خصوصاً غزل کے موضوعات حسن وعشق میں تصوف کی بھی ایک جگہ واضح اور متعین رہی ہے۔ روایت پسندوں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو، جو اس کوچے میں گاہے گاہے نہ بھٹک جاتا ہو، جناب تسکینؔ بھی اس کوچے کی سیر میں لطف لیتے ہیں: ؎

حقیقت ہے مکاں سارا جہاں ہے لامکاں ہی کا
مگر پھر بھی کوئی مخصوص جا اس کی نہیں اپنی

جدھر دیکھو، اُدھر جلوہ پرستی
ترا جلوہ مذاقِ عام بھی ہے

بُت کدہ چندن سے روشن اور حرم کافور سے
خانۂ دل ہے فروزاں اِک چراغِ طور سے

مٹ گئے تو مِل گیا تیرا نشاں او بے نشاں
جیتے جی تڑپا کئے ہم تجھ کو پانے کے لئے

مخصوص ہے ان کی جلوہ گری، مخصوص ہے تابِ نظارہ
کر لے جو نظارہ جلووں کا، ہر فرد و بشر کا کام نہیں

اُردو شاعروں کا ایک ورثہ غم بھی رہا ہے۔ اس کے برتاؤ کی جہت مختلف رہی ہے، لیکن تنقید نئی ہو یا پُرانی نہ معلوم کیوں اسے شاعروں کا غم چاہے مصنوعی ہی کیوں نہ ہو پسند آتا رہا ہے۔ جناب تسکینؔ کے غم والم کی کیفیات پر مجھے شک کرنے کا کوئی عذر نہیں، بہرحال متذکرہ غم کی روایت کا تسلسل

یہاں بھی دیکھئے:

منّت پذیرِ لذّتِ دردِ نہاں کے ہیں
تجھ سے ہمیں نصیبِ غمِ دو جہاں کے ہیں

تپِ غم سے پُھنکا جاتا ہوں لیکن
زباں پر اُف نہیں یہ میری خُو ہے

یہ امرِ حق ہے کہ حاصل نہیں خوشی مجھ کو
اگر ہے جانِ مسرّت، تو بس یہی غم ہے

ایسا بھی غم نصیب نہ تسکینؔ ہو کوئی
مرنے پہ جس کے آج کوئی نوحہ خواں نہیں

یہ مانا کہ صرفِ فغاں اور بھی ہیں
مری طرح کب بے زباں اور بھی ہیں

بارِ غم سے ہوں آشنا ایسا
بارِ غم جیسے مجھ پہ بار نہیں

لیکن ایسے غم آگیں اشعار کے باوجود جناب تسکینؔ کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کثرت ہے، جن میں زندگی کی خوش رنگیاں، مسرتیاں اور رعنائیاں بکھری پڑی ہیں، تو پھر ان کے المناک، کربناک، پُرسوز اور گداختہ لہجے کی تاویل کیا ہو سکتی ہے۔ اِس کا جواب بھی اُردو شاعری کے اس روایتی تفکّر کے حوالے

سے دیا جاسکتا ہے کہ ایک شاعر ایک ہی وقت میں حزنیہ اور طربیہ دونوں ہی کیفیات کا احاطہ کرتا آیا ہے۔ جناب تسکینؔ کے یہاں غم اور مسرّت کی گنگا جمنی کا راز بھی یہی ہے۔

جناب تسکینؔ کے اِس شعری مجموعے میں کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اِن کے اندر انفرادی راہ اپنانے کی زبردست صلاحیت موجود ہے، شاید وہ اپنی اس صلاحیت کا اندازہ نہیں کر سکے ہیں، ورنہ ایسی روش سے کوسوں دُور رہ کر نئے امکانات کو اپنی گرفت میں لے لینا اِن کے بس میں ہوتا۔ چند چونکا دینے والے اشعار ملاحظہ ہوں:

چاہتی ہے داد اپنی انتہائے بے بسی
ہے نشیمن خاک ہونے کو نظر کے سامنے

پھر بس گئے نظر میں گلستاں نئے نئے
پھر کھائیے فریبِ بہاراں نئے نئے

ہم مسافر ہیں رہِ ہست و عدم کے تنہا
ہم ہی لے دیکے بہ ہر رنگ بہ ہر گام رہے

فنا کا درس جو شبنم سے ہم لئے ہوتے
ہمارے غم کی بھی رُوداد دوسری ہوتی

نہ ٹوٹا سلسلہ راہِ عدم کا
مسافر کارواں در کارواں ہے

مسیحا اُٹھ گیا بالیں سے میری سرنگوں ہوکر
کچھ آساں تو نہیں شعلہ بجاں کا چارہ گر ہونا

میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ جناب تسکینؔ اپنی قوتِ فکر کو نئی سمتوں کی طرف موڑ سکتے ہیں۔ اِن کے یہاں زبان کا رچاؤ اور کلاسکی سج دھج ہے، وہ اپنی فکری صلاحیتوں کو نئے اُفق کی طرف مائل کر سکیں، تو اُن کا بھی بھلا ہو اور اُردو شاعری کا بھی ـــــــ مجھے اس وقت اُن کے اپنے ایک شعر کی طرف رجوع کرنا ہے : ؎

قوتِ فکر بہ اندازِ دگر پیدا کر
جس سے گرویدہ جہاں ہو وہ اثر پیدا کر

(ڈاکٹر) وہاب اشرفی
پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف اُردو
ٹیچنگ اینڈ ریسرچ، مگدھ یونیورسٹی۔ گیا

ع

بازیچۂ طفلاں نہیں کچھ میرا سا ہونا

ہر چند ترا طرزِ بیاں خوب ہے تسکیںؔ

غزلیں

بازیچۂ طفلاں نہیں کچھ میر سا ہونا
ہر چند ترا طرزِ بیاں خوب ہے تسکیں
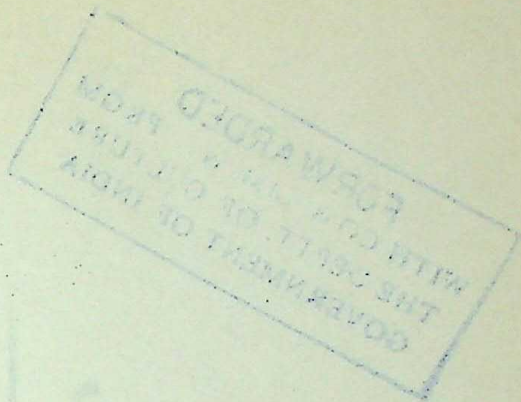
۷۸۶

حمد

ترا جلوہ یوں تو کہاں نہیں، سرِ عرش ہے سرِ طور ہے
جو نظر ہی کام نہ کر سکے تو نظر کا پھر یہ قصور ہے

ترے جلوے کا یہ کمال ہے کہ عیاں بھی ہو کے عیاں نہیں
ہے رگِ گلو سے قریب اگر، تو ہر اِک نگاہ سے دور ہے

تری ذات سے وہ لگاؤ ہے، ترے آستاں کے غلام کو
کہ نہ حرصِ مال و منال ہے، نہ ہوائے حور و قصور ہے

یہ کشش ہے کیسی جو دَیر سے سوئے کعبہ لے کے چلی مجھے
نہیں دل کو میرے خبر مگر کوئی بات اس میں ضرور ہے

تری سمت دستِ طلب بڑھا ترے دَر پہ میری جبیں جھکی
یہی اہلِ زر کی نگاہ میں مرے حوصلوں کا قصور ہے

۲

(بقیدِ مطلع)

سر پہ نوشاہ کے ہے آج انوکھا سہرا
مرحبا! مرحبا! ہے نور میں ڈوبا سہرا

کہکشاں ہے کہ ہے یہ چاند کا ٹکڑا سہرا
فرش سے عرش تلک دھوم ہے سہرا سہرا

نخلِ اُلفت ہے کہ ہے نخلِ تمنّا سہرا
کشتِ اُمّید میں شاداب ہے کیسا سہرا

میری آنکھوں سے تو دیکھے کوئی تیرا سہرا
حُسن میں چاند لگاتا ہے یہ کیا کیا سہرا

ضَو فشاں ہو کے ترے رُخ پہ جو ٹھہرا سہرا
رات کو دن کئے دیتا ہے یہ تیرا سہرا

تیری اُلفت کا سہارا اپنا تیرا سہرا
آج کی شب ہو مبارک تجھے شاہا سہرا

مدح خواں تیرا زمانے کا زمانا سہرا
کس نے اِس شان سے گوندھا ہے نرالا سہرا

۵

کِس کے جلووں سے مجلّٰی ہوا ایسا سہرا
کِس نے یہ نُور کے سانچے میں ہے ڈھالا سہرا

کَل تو اَوروں نے کہا اَچھّے سے اَچھّا سہرا
آج تسکیںؔ نے مگر کہہ دیا کیسا سہرا

★

رازو نیازِ حُسن و عشق اپنی قسم سمجھ لیا
نقشِ قدم سے آپ کے رازِ اہم سمجھ لیا

جاتے ہی بزمِ ناز میں شیشۂ دل تھا پاش پاش
گزرا میں جس مقام سے دل کا بھرم سمجھ لیا!!

آپ کی ہر خوشی مجھے جان سے تھی عزیز تر!
آپ نے جب ستم کیا، میں نے کرم سمجھ لیا!!

شام و سحر کا فرق بھی ہجر میں تیرے مِٹ چکا
صبحِ نشاط جب ہوئی، شامِ الم سمجھ لیا!!

سینے میں اِک چُبھن جو ہے، آپ کے غم کا فیض ہے
پاتے ہی لذتِ خلش خود کو اہم سمجھ لیا!!

عشقِ جنوں نواز نے عالمِ بے ثبات میں
کِس کو خُدا بنا لیا، کِس کو صنم سمجھ لیا!!

ہونا وفا شعار بھی لانا ہے جُوئے شِیر کا
میں نے وفا کی راہ میں رکھ کر قدم سمجھ لیا!!

عاشقِ غم نواز نے زُلفِ جنوں کی چھاؤں میں
بربطِ دل کے راگ کو نغمۂ غم سمجھ لیا!!
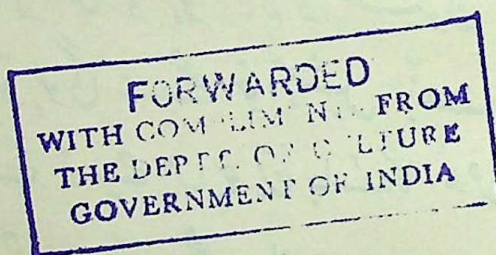
(۴)

داغِ حسرت سے جو سینہ ہے مزیّن میرا
رشکِ فردوس، تصوّر میں ہے گلشن میرا
سہل ہر چند نہ تھا ضبط کا یارا لیکن
آج تک پاک رہا اشک سے دامن میرا
گُل بداماں نہ سہی، خار بداماں ہی سہی
اُن کا احسان کہ خالی نہیں دامن میرا
اُن کی پلکوں پہ بھی روشن ہوں محبت کے چراغ
پُر اثر اتنا تو ہو نالہ و شیون میرا
پھر تو ہوگی نہ مجھے خواہشِ جنّت ہرگز
اُن کے کوچے میں جو بن جائے گا مدفن میرا
ہاتھ آ جائے مجھے جامِ حیاتِ ابدی
اُن کی خاطر جو کٹے سر یہ صریحاً میرا
داغِ عصیاں مرے کافور نہ ہوں کیا معنی
اُن کے دامن سے جو وابستہ ہو دامن میرا

بیکسی مجھ پہ تو آنسو ہی بہاتی اب تک
شمعِ تُربت سے مگر نام ہے روشن میرا
چاند تاروں سے ہوئی ہے سرِ تُربت رونق
آج محرومِ چراغاں نہیں مدفن میرا
میں نے اُس راہ میں رکھا تھا قدم اے تسکیںؔ
جس میں ہونے کو تھا برباد نشیمن میرا

★

(بقیہ مطلع)

رنج و غم سے رہا دل کو یوں واسطا
جیسے کانٹوں میں غنچہ کوئی ہو کھلا

تیرے جلووں میں کچھ اس طرح کھو گیا
تا ابد مجھ کو ڈھونڈھے گی چشمِ فنا

مژدۂ دید لائی نہ بادِ صبا!!
منتظر میرا حسرت زدہ دل رہا

شکوۂ جورِ افلاک ہے ناروا
دل وہی ہے جو غم سے رہا آشنا

کاوشِ غم کا جاری رہا سلسلہ
مجھ کو ملتا رہا زندگی کا مزا

کاش سُنتے میرے دل کا غم ماجرا
بھول جاتے زمانے کا ہر واقعہ

وہ ستم جو زمانے کا مجھ پر ہوا
حادثوں میں ہے سب سے بڑا حادثہ

دشمنِ جاں خرد نے جسے کہہ دیا
ہے وہی سوزِ غم آج وجہِ بقا!!

کیا ہے افسوں نگاہی تری ساقیا
جس پہ ڈالی نظر اُس کو اپنا لیا

خود ہے زیرِ قدم منزلِ ارتقا
میں نہیں تیرا محتاج عقلِ رسا

دُور تھا جس سے تسکیں سفینہ مرا
ہے وہی سامنے آج موجِ بلا ★

(۶)

تری یاد دل میں بسا کر بھی دیکھا
تجھے وجہِ تسکیں بنا کر بھی دیکھا
فریبِ تمنّا میں آکر بھی دیکھا
تصوّر میں جنّت بنا کر بھی دیکھا
نہ آنا تھا تُم کو نہ آئے کبھی تم!!
چراغِ محبّت جلا کر بھی دیکھا
سکوں مجھ کو اے کاش ہوتا میسّر
ترا تذکرہ لب پہ لا کر بھی دیکھا
نہیں سہل تھا سامنا مشکلوں کا!!
عجب تیرِ غم ہم نے کھا کر بھی دیکھا
ہوئی کب یہ شادابِ شاخِ تمنّا
شب و روز آنسو بہا کر بھی دیکھا
جفاکیش نے اپنی فطرت نہ بدلی
وفاؤں کی شمعیں جلا کر بھی دیکھا

رہے ہم تو محروم ہی اُن کے در سے
جبینِ تمنّا جُھکا کر بھی دیکھا!!
مری تشنگی کا تھا احساس کس کو
اُسے شیشۂ دل دکھا کر بھی دیکھا!!
رہیں حسرتیں دل کی دل ہی میں تسکیں
ستمگر کے مقتل میں جا کر بھی دیکھا

۷

تمہارا آستانہ دَیر ہوگا یا حرم ہوگا
کہے گا دل جہاں مجھ سے وہیں سَر اپنا خَم ہوگا

رہِ مہر و وفا کی منزلیں مجھ سے یہ کہتی ہیں
وہیں پر رفعتیں ہوں گی جہاں تیرا قدم ہوگا

رہوں گا تا بکے بن کر مرقع یاس و حسرت کا
خدا جانے مرا سر کب سرِ مقتل قلم ہوگا

کسی سے دادخواہی میری توہینِ وفا ہوگی
زمانے کا زمانہ جبکہ سرگرمِ ستم ہوگا!!

فضائے پُرسکوں ہے پیشِ خیمہ موجِ طوفاں کا
کہاں تک اے دلِ مغموم مجھ سے ضبطِ غم ہوگا

ہزاروں پھول صدقے اے جگرِ ناسور پر تیرے
کہ یہ داغِ محبّت زینتِ باغِ ارم ہوگا

تقابل ہو تو کیا تیرے کرم کا اپنے سجدوں سے!!
یقیں ہے میرے سجدوں سے فزوں تیرا کرم ہوگا

نظر آئیں گے یوں تو کُشتگانِ غم بہت لیکن
جہاں میں کون میری طرح بھی تصویرِ غم ہوگا

نظر آتی نہیں صورت کوئی غم سے مفر کی اب
خُدا جانے کہ اے تسکین کیا انجامِ غم ہوگا

پہلو سے اس طرح دلِ پُرغم نکل گیا
جیسے مزاجِ گلشنِ عالم بدل گیا

اُفتادِ عشق تھی کہ نہ دل کو بچا سکا
خنجر نگاہِ ناز کا اس طرح چل گیا

تا حشر اپنے ذہن میں رہ جائے گی یہ بات
سائے میں ظلم و جور کے جو دل بہل گیا

لائی نگاہِ ساقیٔ مہوش وہ انقلاب
میخانۂ حیات کا ساغر بدل گیا

بچنا کسی کا ایسے میں امرِ محال تھا
خنجر نگاہِ وقت کا رُک رُک کے چل گیا

برقِ نگاہِ ناز کا ہوتے ہی سامنا!
خرمنِ سکونِ قلب کا پل بھر میں جل گیا

نازاں ہے اُس کے سجدوں پہ سنگِ درِ حبیب
کوچے میں عشق کے جو کوئی سر کے بل گیا

نازک ہے کتنا کہیئے تو تسکین اپنا دل
چٹکی اُدھر کلی تو اِدھر یہ مچل گیا!!

(۹)

دل لذّتِ فراقِ صنم پا کے رہ گیا
کتنا حسیں فریبِ الم کھا کے رہ گیا

گلزارِ عشق بھی کسی مقتل سے کم نہیں
جس پھول کو بھی دیکھئے مرجھا کے رہ گیا

نظّارۂ جمال کا عالم نہ پوچھئے!!
ذوقِ نظر کو میرے وہ تڑپا کے رہ گیا

ایسی نسیم یاس بھی چلتی رہی یہاں
شعلہ فرازِ شوق کا تھرّا کے رہ گیا!

عکسِ جمالِ یار تھا ہر شئے سے آشکار
دل کو بقدرِ ذوق میں بہلا کے رہ گیا

اب مقصدِ حیات ہے تسکین تیرا کیا
ہر غنچۂ مراد تو کمھلا کے رہ گیا

(۱۰)

ذوقِ دل پائمال کیا ہوگا
مر کے جینا محال کیا ہوگا

جس کے جلووں کا خواب ہو رنگیں
اُس کا رنگِ جمال کیا ہوگا

دورِ ساغر چلے جو نظروں سے
ہوش کا پھر سوال کیا ہوگا

اُس نے اور اِک لگا دیا نشتر
زخم کا اندمال کیا ہوگا!!

تیرے بیمارِ غم کا فرقت میں
پوچھ دل سے کہ حال کیا ہوگا!!!

جا رہا ہوں میں اُن کے کوچے میں
جانتا ہوں مآل کیا ہوگا!!!

جب ہے آنکھوں سے حالِ دل روشن
کوئی پرسانِ حال کیا ہوگا!!!

میں نے دیکھا ہے حشر غنچوں کا
میرے دل کا بھی حال کیا ہوگا

جس نے بخشا سرورِ لافانی
ایسے غم کو زوال کیا ہوگا

ضبطِ غم کو تو راہ دی میں نے
کون جانے مآل کیا ہوگا!

دل ہے تسکیں رہینِ حسنِ یار
خُلد کا اب خیال کیا ہوگا!!

★

(۱۱)

چلی آتی ہے پھر موجِ بلا کیا
تماشا دیکھتا ہے ناخدا کیا؟

عبث ہے لائے ماضی کا ہے رونا
نہیں اُمّیدِ فردا ہمنوا کیا؟

گریں گی بجلیاں تا چند ہم پر!!
نہ ہوگا بابِ رحمت اب بھی وا کیا

اُٹھائیں رنج و غم آخر کہاں تک
نہ لائے گی کوئی مژدہ، صبا کیا!

وفاؤں پر بجا ہے ناز لیکن!
وفاؤں کا مِلا اب تک صِلا کیا؟

کئے جاتے ہیں اُن سے معذرت ہم
نہیں معلوم ہے اپنی خطا کیا؟

ہمیں بڑھنا ہے سُوئے صبحِ منزل
سیاہی روک دے گی راستا کیا؟

نہ پھُولو چار دن کی چاندنی پر!
نہ دے گی داغِ غم اس کی ادا کیا!

مبارک تجھ کو شانِ بے نیازی
کسی بُت سے بھی اُمیدِ وفا کیا!

رُلائے گا غمِ دل بھی کہاں تک
پئے تسکیں نہ آئے گی قضا کیا؟

جہانِ رنگ و بُو دیکھا تمہارا
کہاں بہلا دلِ مضطر ہمارا؟
خودی کو بحرِ غم میں جب اُتارا
نظر میں رقص فرما تھا کنارا
نگاہِ یار کا پاکر اِشارا!
کیا حنظل کو بھی میں نے گوارا
فراقِ یار ہے معراج پر اب!
رُکے گا کب مرے اشکوں کا دھارا
کھُلے ٹانکے سبھی زخمِ جگر کے
بنا رشکِ اِرم سینہ ہمارا
خوشا قسمت! ترا غم ہاتھ آیا
مِلا جینے کا مجھ کو اِک سہارا
ترے جلووں میں کھو کر رہ گیا میں
عجب ہے دلنشیں تیرا نظارا

۲۴

رہی ہر جستجو ناکام ہو کر!!
تجھے ہر گام پر میں نے پکارا

عروجِ ماہِ کامل سے غرض کیا!
مجھے تسکین ہے شامِ غم گوارا

(۱۳)

نجانے میری وحشت پر اُسے کیا کیا گماں ہوگا
کبھی وہ خندہ زن ہوگا، کبھی صرفِ فغاں ہوگا
وہ ہوگا اور جو اَے برق تجھ سے بدگماں ہوگا
نہیں پروا جو تیری زد میں اپنا آشیاں ہوگا
بدل دیں گے نظامِ انجمن ہم باتوں باتوں میں
ہمارا عزم ہم پر ایک دن جو مہرباں ہوگا
نہ جانے تو نے کتنے آشیانوں پر کئے احساں
کرم میرے نشیمن پر بھی اَے برقِ تپاں ہوگا؟
عجب کیا آشیاں اپنا گل و گلزارِ جنّت ہو
کرم اِس پر کبھی تیرا جو اَے برقِ تپاں ہوگا
کئے جاتے ہیں تعمیرِ نشیمن یہ سمجھ کر ہم!
حریفِ آشیاں بھی تابکے وہ آسماں ہوگا!
سیاہی رات کی کبتک رہے گی راہ میں حائل
سویرا کیا نہ اِس دنیا میں اَے اہلِ جہاں ہوگا؟

بڑھے گا سوئے منزل کارواں کچھ اس طرح اپنا
کہ آئے گا نظر کچھ، وہ غبارِ کارواں ہوگا

بھلا دشواریاں کب تک رہیں گی راہ میں حائل
سرِ منزل کسی دن تو ہمارا کارواں ہوگا

گریزاں کیوں ہوا جاتا ہے دردِ دل سے تو ناداں
ترے ناموسِ غم کا اِک یہی تو پاسباں ہوگا

یہی اِک بیکسی روئے گی تیری موت پر تسکیںؔ
کہ تیرا اِس جہاں میں کون ہے جو نوحہ خواں ہوگا

★

(۱۴)

ہم رہینِ ستم ہزار رہا
دل پہ لیکن نہ کچھ غبار رہا
دامنِ ہوش تار تار رہا
زندگی کو بھی کب قرار رہا
موجِ غم سے جو ہمکنار رہا
ایک گو نہ مجھے قرار رہا
ذہن میں عکسِ گلعذار رہا
دل مرا مائلِ بہار رہا
ذہن ڈوبا تھا کیف میں جیسے
ذکر اُن کا جو بار بار رہا!!
رات آنکھوں میں کاٹ دی میں نے
کس ستمگر کا انتظار رہا
حرفِ شکوہ زباں پہ کیوں آتا
مجھ کو پاسِ مزاجِ یار رہا

کن نگاہوں کا یہ کرشمہ تھا
زندگی بھر جو مے گسار رہا
پُرزے پُرزے ہوئے تمنّا کے
کون مجھ سا بھی دلفگار رہا؟
سب کے سب ہو گئے کنارہ کش
درد ہی تھا جو غمگسار رہا
عہدِ رفتہ کا حادثہ گویا
اِک چراغِ سرِ مزار رہا
صبحِ رنگیں کی آس میں ہمدم
شامِ غم سے بھی ہمکنار رہا
کِس سے کہتا میں حالِ دل تسکینؔ
کب مرا کوئی غمگسار رہا

★

(۱۵)

دل اپنا تو پتّھر کا بنایا نہیں جاتا!
ہے قصّۂ پُر درد سُنایا نہیں جاتا
کیا رنگِ خلشہائے جگر اُن کو بتائیں
یہ درد ہے وہ شئے جو دکھایا نہیں جاتا!
کیوں آہ و فغاں پر ہے تُلا اے دلِ مضطر؟
کیا بارِ الم تجھ سے اُٹھایا نہیں جاتا؟
جس نے ہمیں یوں خانماں برباد کیا ہی
وہ حادثۂ عشق بھُلایا نہیں جاتا!!
کب لفظِ محبّت بھی مرے دل سے مٹے گا
جو دل پہ ہوا نقش، مٹایا نہیں جاتا!!
ہم آ گئے خود دامِ محبّت میں کسی کے
دھوکا کبھی اِس طرح تو کھایا نہیں جاتا
مانا کہ ہے داخل تری فطرت میں جفا بھی
فِتنہ مگر اِس طرح جگایا نہیں جاتا

۳۰

دل میرا ابھی رکھ ساقیٔ محفل تو میں جانوں
یوں جشنِ بہاراں تو منایا نہیں جاتا
گم کردۂ منزل تو کیا جاتا ہے تسکیں
رستہ مگر منزل کا بتایا نہیں جاتا

★

حاصلِ تیرِ نظر یاد آیا
پھر مجھے زخمِ جگر یاد آیا

جذبِ کامل کا اثر یاد آیا
رنگِ گُل، ذوقِ نظر یاد آیا

پھر وہی برق کی باتیں ہمدم!
ہائے! اُجڑا ہوا گھر یاد آیا!

بھُولنے کو تو اُسے ہم بھُولیں
کیا کریں گے وہ اگر یاد آیا!!

واہ! کیا کہیئے تصوّر اُس کا
جلوۂ نُورِ سحر یاد آیا!!

ہمسفر ہے نہ ہے رہبر کوئی
ہائے کب عزمِ سفر یاد آیا

حال پوچھا جو کسی نے تسکینؔ
سوزِ دل، دردِ جگر، یاد آیا ★

دمِ آخر، دلِ مضطر کو تیرا کیا سلام آیا
بڑی مشکل میں گویا دو دِ دل، ہی اپنا کام آیا

کہاں کی بیخودی ساقی، سرورِ سرمدی کیسا
مرے حصّے میں آیا بھی تو خالی ایک جام آیا

تکلّف بر طرف ساقی، نگاہیں چار تو کر لے
تری محفل سے جانے کو کوئی کب تشنہ کام آیا

بہار آتے ہی پہنائیں خرد نے بیڑیاں مجھ کو
خرد کی انجمن میں کیا جنوں کا بھی مقام آیا!

فراقِ یار میں قطرہ اِک اِک آنسو کا مژگاں پر
ہوا پُر کیف منظر جیسے جیسے وقتِ شام آیا

تری محفل میں آیا تذکرہ غیروں کا جب ساقی
ترے لب پر نہ جانے کس طرح میرا بھی نام آیا

ہوئی منظور ساقی کو جو خاطر غم نصیبوں کی
مقدّر سے مرا ٹوٹا ہوا ساغر ہی کام آیا

چھڑا جب تذکرہ دار و رسن کا اُن کی محفل میں
خوشا قسمت! صفِ منصور میں اپنا مقام آیا

وہی بادہ وہی ساغر، وہی اندازِ میخانہ
مگر کہنے کو تسکیں از سرِ نَو دورِ جام آیا

۱۸

تمہیں بھی یاد ہوگا وہ زمانا
مرا رونا، تمہارا مسکرانا

محیطِ آب و گِل کا کیا ٹھکانا
ہے مشکل ماسوا میں تجھ کو پانا

گذرنے کو تو ہم گُلشن سے گذرے
ہوا مشکل مگر دامن بچانا!

ترستی ہیں اُنہی جلووں کو آنکھیں
دکھانا، پھر وہی جلوے دکھانا!

رہے گا رازِ دل تا چند مخفی
برنگِ اشک دامن پر ہے آنا

وہیں طرحِ نشیمن ڈال دی ہے
جہاں بجلی کا ہوتا ہے نشانا

میانِ خار ہیں گُل، پھر بھی خوش ہیں
اُنہی سے ہم نے سیکھا مُسکرانا

مدد اے ضبطِ غم، اے چشمِ پُرنم
کہیں رُسوا نہ کردے یہ زمانا
کوئی دیکھے کسی کی مستیِ مَے
مرا محروم میخانے سے جانا!!
تری آنکھوں میں ساقی کھو گئے ہم
ہماری بے خودی کا کیا ٹھکانا!
مثالِ شمع گھُلتا جا رہا ہوں
بڑی مشکل ہے لب پہ آہ لانا!
ہمیں کیا خوف ہو دار و رسن کا
ترے غم کو گلے سے ہے لگانا
اُدھر طوفاں، اِدھر نازک سی کشتی
نتیجہ اِس کا تھا بس ڈوب جانا!
کہاں تسکیں! کجا دشواریاں وہ
خوشا قسمت! ملا اُن کا ٹھکانا

★

(۱۹)

مجھے احساس جادہ کا رہا باقی نہ منزل کا
اندھیرے میں ہوا گُم کارواں کچھ اِس طرح دل کا

تقابل کیا غریقِ بحرِ غم کا موجِ طوفاں سے!
یہاں تو ڈوب کر بھی ہاتھ میں دامن ہے ساحل کا

تبسّم بھی نگاہِ یاس پر اِک طنز ہے ہمدم!
کھُلا یہ رازِ اپنے غم کدے سے شمعِ محفل کا

مَیں صحرا میں نہ چھوڑوں گا تجھے اے چاک دامانی
کہ غربت میں سہارا ہے فقط اِک وحشتِ دل کا

یہاں اندازۂ طوفاں کنارے سے بھی کرتے ہیں
مگر آساں نہیں آسان ہونا ایسی مُشکل کا!

سرِ منزل حقائق کا عَلَم جو نصب ہم کر دیں
خدا جانے ہو کیا کیا حشر پھر تو زعمِ باطل کا

ہوئے ہیں اِس طرح وارفتہ ہم تو راہِ الفت میں
کسی عنواں ادا ہوتا نہیں مفہوم اب دل کا

کبھی جو نغمہ زن تھے اب ہیں کیوں صرفِ فغاں یارب
نہیں بے وجہ گریہ کچھ، گلستاں میں عنادل کا

ذرا محتاط اَے تسکیںؔ، مبادا بال پڑ جائے
کہ شیشے سے سوا نازک یہ شیشہ ہے ترے دل کا

لکھا ہے خون ہونا ہی مری قسمت میں حسرت کا
کہاں ممکن ہے ہونا بار وَر، نخلِ محبّت کا

نظر کیوں ہے ستمگر کی مرے چاکِ گریباں پر
نِکھرتا جا رہا ہے رنگ شاید میری وحشت کا

معیّن یوں تو ہے اِک دن قیامت کا مگر ظالم
ہوا دھوکا تری رفتار پر اکثر قیامت کا

نہ کیوں مصروفِ تعمیرِ نشیمن ہوں عنادل بھی
کہ محکم ہے تعلّق آسماں سے اہلِ ہمّت کا

خدا رکھے! عجب دنیا ہے اِن رنگیں جمالوں کی
گماں ہوتا ہے اِس کی دلکشی پر مجھ کو جنّت کا!

یونہی مُنہ دیکھتی رہ جائیں گی رنگیں بہاریں بھی
نظارہ کر رہا ہوگا زمانہ تیری عورت کا

کبھی آئی ہنسی بھی تو یہ آنکھیں ہوگئیں پُرنم!!!
بشر کیا ہے، مرقّع ہے، جہاں میں رنج و راحت کا

فغاں کیسی، شکایت کیا، لگی ہے مُہرِ خاموشی!
بھرم اب تک تو ہم نے رکھ لیا ہے عشق و اُلفت کا

حریفوں کو ترے احساس اے تسکیں برابر ہے
ظفریابی کا تیری اور خود اپنی ہزیمت کا

پیشِ نظر ہے جلوہ کیا اُس روئے یار کا
دلکش نظارہ گویا ہے رنگیں بہار کا

داغوں سے اپنا سینہ ہے گلزار خود بخود
گلشن سے کیا موازنہ اِس لالہ زار کا

دار و رسن کا خوف کیا اِک حق پرست کو
پیشِ نظر ہے واقعہ منصور و دار کا

زیرِ لحد جو لے گیا میں قلبِ مضطرب
اُڑنے لگا غبار بھی میرے مزار کا

پایا شبِ فراق ستاروں سے تابناک
میں نے ہر ایک لمحہ ترے انتظار کا!!

ذرّوں سے دل کے میں نے دیا ہے اسے فروغ
شُہرہ ہوا مجھی سے تری رہگزار کا

تسکین چمن سے جبکہ خزاں آشکار ہے
آئے یقین کیا ہمیں فصلِ بہار کا!

اِسے کہتے ہیں اُلفت اور اُلفت کا اثر ہونا
اِدھر اپنا تڑپنا، مضطرب اُن کا اُدھر ہونا

نظر ملتے ہی اُن سے غیر اپنی ہو گئی حالت
یہ کیا تھا طُور کا جلوہ کسی کا بام پر ہونا

اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا، جدھر دیکھا، بلا دیکھی
ادائے ساحری ہے کیا ترا جادو نظر ہونا

لئے انمول موتی چشمِ تر ہے اپنے دامن میں
کہو شبنم کو اشکوں سے مرے سیکھے گُہر ہونا

اُسی کا نام روشن ہے کسی کے کام جو آئے
کہ شمعِ بزم سے اچھا چراغِ رہ گذر ہونا

مسیحا اُٹھ گیا بالیں سے میری سرنگوں ہو کر
کچھ آساں تو نہیں شعلہ بجاں کا چارہ گر ہونا

مری آشفتگی کی قدر و قیمت غیر کیا جانیں
نہیں آساں ہے اے تسکیںؔ، مذاقِ دردِ سر ہونا

۲۳

وہی زورِ قلم ہے، جس کا پڑتا ہو اثر اچھا
سخن ہے وہ سخن، سمجھیں جسے اہلِ نظر اچھا

غمِ دوراں کا جس میں ہو ذرا بھی شائبہ ہمدم
وہی ہے دردِ سر اچھا، وہی دردِ جگر اچھا!

پیامِ جشنِ نَو دیں جھلکیاں، جس کی زمانے کو
وہی تابندگی افضل، وہی نورِ سحر اچھا!

جو قلبِ ناتواں میں عزمِ نَو کی بجلیاں بھر دے
مسیحائی وہی اچھی، وہی ہے چارہ گر اچھا

جہاں ہو باغباں اپنا، نہ ہو صیّاد کا کھٹکا!!
وہی صحنِ چمن بہتر، وہی بیشک ہے گھر اچھا

کرے نورِ سحر پیدا جو آنسو شامِ فرقت میں
خوشا اے کاوشِ غم، ہے وہی تو اِک گہر اچھا

نہیں کرتا جو محکم رشتۂ اُلفت کسی عنواں
اُسے کیوں سلسلہ کہیئے، وہ کب تارِ نظر اچھا

وفا کا نام روشن جو زمانے میں کرے ہمدم
وہی ہے شامِ غم اچھّی، وہی داغِ جگر اچھا

سُنے بھی تو کوئی کب تک، اسے سُنتا رہے کیونکر
حقیقت میں، فسانہ دردِ و غم کا مختصر اچھّا

(۲۴)

شوقِ منزل بلا سے لوٹے گا
اِس کا دامن نہ مجھ سے چھوٹے گا

لے کے دل کے اُفق پہ جامِ غم
آفتابِ نشاط پھوٹے گا

دُور وہ دن نہیں سیہ کارو!
جب طلسمِ فریب ٹوٹے گا!

قلبِ مظلوم صبر کے ہاتھوں
راحتوں کا خزانہ لوٹے گا!

بات جب حد سے بڑھ گئی یارو!
دامنِ ضبط کیوں نہ چھوٹے گا!

اِک لگاؤ ہے عرش سے دل کو
مجھ پہ کیا آسمان ٹوٹے گا!

طبعِ نازک کو کیا خبر تسکینؔ
اس پہ غم کا پہاڑ ٹوٹے گا ★

(۲۵)

خُدا تخلیق پر اپنی وہاں نازاں نہیں ہوتا
کمالِ خُلق کا حاصل جہاں انساں نہیں ہوتا

مری تخلیق پر خالق بھی کب نازاں نہیں ہوتا
نہ ہوتا میں تو کیا اُس کا جہاں ویراں نہیں ہوتا؟

بھرے ہیں گوہرِ مقصود دامن میں ازل ہی سے
رہینِ منّتِ یزداں تہی داماں نہیں ہوتا!

فقط ہیں چار ہی تنکے تو یوں کہنے کو گلشن میں
مگر اے برق اِن پر کب ترا احساں نہیں ہوتا

خموشی سے مثالِ شمعِ محفل جان دیتا ہے
گرفتارِ غمِ جاناں کبھی گریاں نہیں ہوتا!

ہوا جاتا ہے سینہ خود بخود گلزار داغوں سے
یہ وہ گلشن ہے جو منّت کشِ باراں نہیں ہوتا

اگر میں گھر گیا موجِ حوادث میں تو کیا غم ہے
یہ روشن ہے کہ کوئی مستقل طوفاں نہیں ہوتا

نہ ہو جب تک جگر کے پار غم کا تیر، اَے تسکیںؔ
سکونِ دل مجھے حاصل کسی عنواں نہیں ہوتا!

(۲۶)

فراقِ جاناں میں حال اپنا، یقینِ محکم ہے، زار ہوگا!!!
نہ اشک آنکھوں سے ہوگا جاری، جو ہوگا اِک آبشار ہوگا

رفیقِ شمعِ خموش ہوگی، جلے گا دل تو نہ اُف کروں گا!!
اسی سے درسِ سکوت لُوں گا، اسی سے دل کو قرار ہوگا

کہاں تھی میری مجال ساقی کہ تجھ سے آنکھیں میں چار کرتا
جو پی تھی میں نے ازل میں ساقی، اسی کا شاید خمار ہوگا

جو ہوگی محفل میں شمع روشن، پتنگا آئے گا خود ہی کھنچ کر
اُجالا مہر و وفا کا لے کر، خوشی سے اُس پر نثار ہوگا

فریبِ ہستی جو کھا رہا ہوں، خودی کو گویا بھُلا رہا ہوں
یقیں ازل سے یہی تھا مجھ کو کہ ہوش اِک دن شکار ہوگا

یہاں کی ہر شئے ہے جبکہ فانی، ثبات کِس کو یہاں ہے لیکن
کہاں رہے گی یہ روح تیری، کہاں یہ مشتِ غبار ہوگا!

(۲۷)

دل میں اُس شوخ کا نشاں نہ رہا
کوئی اِس گھر کا پاسباں نہ رہا

بارِ غم دل اُٹھائے گا کب تک
اِس کے قابل یہ ناتواں نہ رہا

طُور کا ذکر آخرش کیوں ہو!
جلوہ اُن کا کہاں کہاں نہ رہا

درخورِ اضطرابِ پیہم ہوں!
میری نظروں میں امتحاں نہ رہا

میں وہ گُل ہوں جو اِس گلستاں میں
ہائے کِھل کر بھی شادماں نہ رہا

دَیر و کعبہ کی قید ہے ناحق
تیرا مخصوص آستاں نہ رہا

اَشکِ غم بھی نہ معتبر ٹھہرا
دہر میں کوئی رازداں نہ رہا

طرح کیوں ڈالوں آشیانے کی
باغباں بھی تو مہرباں نہ رہا

ضبط کی حد سے اب گذرتا ہوں
دل بھی قابو میں جانِ جاں نہ رہا

آ کے مژگاں پہ سیلِ اشکِ رواں
رُک گیا جیسے کچھ نشاں نہ رہا

اِتنی مضطر ہے برق کیوں تسکیںؔ
آشیاں ہی کا جب نشاں نہ رہا

★

(۲۸)

داغِ جگر کے سامنے رنگِ بہار کیا
اِس چشمِ خوں فشاں کے لئے لالہ زار کیا

وہ دیکھتے ہیں میری طرف بار بار کیا؟
تیرِ نظر ہے دشمنِ صبر و قرار کیا؟

دامن کی کشمکش سے پریشاں ہے جب جنوں
اس کے لئے بہار کا پھر انتظار کیا؟

کٹتی ہو جس کی کشمکشِ غم میں زندگی
اُس کو سرورِ آمدِ فصلِ بہار کیا؟

معلوم ہے! بنے گا چمن میں جو آشیاں
برگشتگیٔ وقت کا بھی اعتبار کیا!!

راہِ وفا ہیں جو ہوا برباد آرزو!!
اُس دل کو اب کروں گا کسی پر نثار کیا!

مژگاں پہ آکے اشک کے قطرے جو رُک گئے
اُن کو بھی تیرے جلووں کا ہے اِنتظار کیا؟

تسکینؔ حبابِ بحر ہے کِس درجہ بے ثبات
تیری بھی زندگی کا بھلا اعتبار کیا؟

★

(۲۹)

جبینِ شوق جُھکائی، جُھکا کے بھول گیا
خودی کا داغ مٹایا، مٹا کے بھول گیا

نظر کو اُن سے ملایا، مِلا کے بھول گیا
وفا کا نقش جمایا، جما کے بھول گیا

کسی کی یاد میں خود کو مِٹا کے بھول گیا
وفا کی راہ میں ہستی لٹا کے بھول گیا

حجابِ صورت و معنیٰ اُٹھا کے بھول گیا
کہ بختِ خفتہ کو اپنے جگا کے بھول گیا

تجلّیات کی دنیا بسا کے بھول گیا
نظر کو طُور کا جلوہ دکھا کے بھول گیا

بنا بنا کے حیاتِ دوام کا نقشہ!!
خود اپنے ہاتھوں ہی آخر مٹا کے بھول گیا

کہاں کا ذکرِ نشیمن، کہاں کی یادِ چمن
قریبِ دام میں آیا تو آ کے بھول گیا!

مری اُمید کا کیا ذکر اِس گُلستاں میں!
گلوں کے شوق میں آنکھیں بچھا کے بھول گیا

کہاں کا حرفِ شکایت، کہاں کی آہ و فغاں
اُٹھا جو درد تو دل میں دبا کے بھول گیا!

یہ مدّعا مرا کیسا ہے مدّعا تسکیں
فلک کو آہ سے اکثر ہلا کے بھول گیا

جلوۂ جاناں کچھ ایسا رنگ دکھلانے لگا
میں بھی دانستہ فریبِ حوصلہ کھانے لگا!
رنگ آخر جذبۂ اُلفت مرا لانے لگا
مرغِ بسمل ہو کے دل اُن کو بھی تڑپانے لگا
حالِ دل اپنا ہوا چہرے سے اُن کے آشکار
رنگ اِک آنے لگا اور رنگ اِک جانے لگا
باعثِ کیفِ نہاں دل کی خلش بھی ہو گئی
رفتہ رفتہ دل ترے غم کا مزہ پانے لگا
مضطرب میں ہو گیا دیکھی جہاں کوئی کلی
غنچۂ خاطر نظر میں جیسے مرجھانے لگا
جائے بھی تو اب کہاں تسکیں پئے تسکین ذوق
رہتے رہتے دل تو صحرا میں بھی گھبرانے لگا

(۳۱)

رازِ ونیازِ عشق کا میخانہ آگیا
اے دل مقامِ سجدۂ رندانہ آگیا

جب فصلِ گُل کا ذہن میں افسانہ آگیا
ناگاہ رقص میں دلِ دیوانہ آگیا!!

زلفِ سیہ جو دیکھ لی رخسارِ یار پر
آنکھوں میں عکسِ کعبہ و بُتخانہ آگیا

دیکھے سے جس کے ہوش میں آجائیں بادہ خوار
رحمت کا ایسا دور میں پیمانہ آگیا

دامن ہمارے دل کا نہ داغوں سے بچ سکا
دیکھا حرم تو ذہن میں بُتخانہ آگیا

ساقیِ غم نواز کی وہ گردشِ نگاہ!
ایسی تھی جیسے دور میں پیمانہ آگیا

کب میکشوں سے ہوتی بھی رنگیں کوئی خطا
ابرِ کرم تو خود لئے پیمانہ آگیا

کیوں ہر قدم پہ مشکلیں حائل ہیں راہ میں
تسکیں ضرور کوچۂ جاناں آگیا!!

۳۲

بہار آتے ہی چھیڑا ہے یہ کس نے سازِ الجھن کا
مکمّل ہو گا اے دل خود فسانہ دست و دامن کا

بھگوئیں ہم جو دامن آج خود اشکِ ندامت سے
تو پھر دُھل جائے اِک اِک داغِ عصیاں اپنے دامن کا

سمٹ آئی کہاں سے تیرے عارض میں یہ تابانی
کہ حیراں رہ گیا اے ماہرو آئینہ گلشن کا

بہارِ عارضِ رنگیں ہے رشکِ گلستاں شاید
رُخِ جاناں کے آگے فق ہوا ہے رنگ گلشن کا

جھڑی آنکھوں نے میری یوں لگا رکھی ہے اے ہمدم
برسنے سے نہیں تھکتا ہے جیسے مینھ ساون کا

تجھے ڈھونڈا نہ پایا، اور تجھے پایا جہاں دیکھا
یہی اِک دل ہے آئینہ بنا جو تیرے مسکن کا

سکوں آخر میسّر ہو گا مجھ کو بھی کبھی تسکیں
میں پوچھوں دل کی دھڑکن سے خیال آئے جو مامن کا ★

۳۳

اِس دَورِ ستم کوش نے وہ زور دکھایا
مجبوروں کو کچھ اور بھی مجبور بنایا

وہ فَرد ہے آفاق میں تابندہ ستارہ
جِس نے غمِ دوراں کو غمِ عشق بنایا!

تا عمر سنوارا کئے ہم گیسوئے خوباں
زلفِ غمِ گیتی کا ذرا ہوش نہ آیا

برسیگی گھٹا جھوم کے رِندوں کی دُعا سے
کب اس کا سیہ کاروں پہ ہوتا نہیں سایا

روتے ہیں نواسنجِ چمن رنگِ چمن پر
کس کو نہ زمانے کے تغیُّر نے رُلایا

تعمیر کے پردے میں تھی تخریبِ نشیمن
رونا ہمیں آغاز میں انجام پہ آیا!!

جس سوزِ الم پر تھا کبھی اپنا تصرّف
وہ گنجِ گراں مایہ بھی کچھ کام نہ آیا

آلام و مصائب کے تلاطم میں بھی ہم نے
خود کو نہ کبھی پیکرِ فریاد بنایا!!

مقتل میں ہمیں رہ گئے ناکامِ تمنّا
قاتل کا کوئی وار ہمیں راس نہ آیا

کھُل جائے گی تنظیمِ گلستاں کی حقیقت
سر خونِ شہیداں نے کسی دن جو اٹھایا

اشکِ سرِ مژگاں رہا جب موجبِ تسکیں
پھر شکوہ عبث ہے کہ کوئی کام نہ آیا!! ★

(۳۴)

سکونِ دل ہوا جاتا ہے رخصت رفتہ رفتہ اب!
ہوا جاتا ہوں خوگرِ کامِ محبت رفتہ رفتہ اب!

غمِ جاناں پہ حاوی ہو رہا ہے کیوں غمِ دوراں!!
مٹاتا جا رہا ہوں نقشِ الفت رفتہ رفتہ اب

نجانے کیا لگاؤ ہے جنوں سے جیب و داماں کو!
ہوئے جاتے ہیں خود یہ نذرِ وحشت رفتہ رفتہ اب

لئے پیشِ نظر تصویرِ جاناں آج بیٹھا ہوں
ہوئی ظاہر محبت کی کرامت رفتہ رفتہ اب

ہوا ہوں اس طرح مانوس شامِ غم سے اُلفت میں
کہ جیسے بھولتا جاتا ہوں فطرت رفتہ رفتہ اب

ملا موقع جو ہنسنے کا تو آنکھیں ہو گئیں پرُ نم!!
ہوئے جاتے ہیں یکساں رنج و راحت رفتہ رفتہ اب

مٹا کر داغ خود اپنی خودی کا اُن کی چوکھٹ پر
کئے جاتے ہیں حاصل اُن کی قربت رفتہ رفتہ اب

کریں گے ہم نہ رہ رہ کر کبھی آہ و فغاں ہمدم!!
دبائے جا رہے ہیں دردِ الفت رفتہ رفتہ اب

میں کتنا مضطرب تھا غم کے طوفانوں میں اے تسکیں
کٹی جاتی ہے اپنی یہ مصیبت رفتہ رفتہ اب

پہلی سی وہ الفت ہے، نہ پہلی سی وہ نفرت
کس موڑ پہ آئی ہے زمانے کی بھی فطرت

خالص نہیں اب جذبۂ اخلاص بھی یارو
کچھ تم ہی کہو، ہے یہ تصنّع کہ حقیقت؟

انداز ہوں جس شہر کے قاتل کے نرالے
برپا نہ وہاں کیوں ہو قیامت پہ قیامت!

بن جاتا ہے اک دوست بھی اِک دوست کا دشمن
کیا قابلِ تحسین نہیں اِس دَور کی عظمت؟

پل بھر میں بنا دیتی ہے گلزار کو صحرا!!
سرگرمِ عمل کتنی ہے اِس دَور کی وحشت!

تہذیب و تمدّن کے ہیں پارینہ صحیفے
بے معنی نظر آئے نہ کیوں پچھلی روایت

مائل بہ ترقی تو رہی آج کی دنیا!!!
نرغے میں رذالت کے مگر آئی شرافت

اِس دَور کی تہذیب تو یہ کہتی ہے تسکیںؔ
باقی نہ رہے نام کو دُنیا میں حمیّت!

(۳۶)

عبارت مجھ سے ہے تیری حقیقت
تری صورت ہے گویا میری صورت

سمجھتے تُم نہیں جس کی حقیقت!
کہیں برپا نہ کردے وہ قیامت

لرز جاتا ہے جس سے آسماں بھی
ہماری آہ رکھتی ہے وہ قدرت

نہ دیکھو تُم مجھے ایسی نظر سے!
کہ جس نفرت کا حاصل ہو محبّت

نہ بھڑکاؤ مرے سوزِ نفس کو!!
دھواں کردے نہ یہ ایوانِ حشمت

مرے دل میں جو شعلہ موجزن ہے
دئیے جاتا ہے کیا کیا مجھ کو لذّت

نظارہ اُن کے جلووں کا بھی کیا ہو!!
ہمیں کرتے نہیں خود اس کی جرأت

جفائیں جِن کی فطرت میں ہوں داخل
کریں گے کیا کسی پر وہ عنایت

لبہے اخلاص و ہمدردی کا جذبہ
یہی جذبہ ہے معراجِ عبادت

تلاشِ حق میں گم گشتہ ہوں تسکیںؔ!
رہی تا عمر اِک ناکام حسرت

جلوؤں کا اُن کے کارواں ٹھہرا یہاں تمام رات
جیسے تھا غمکدہ مرا صبح نشاں تمام رات

کس کا خیال لے گیا مجھ کو کہاں تمام رات
میری نظر میں ہیچ تھا کون و مکاں تمام رات

آہ و فغاں کی حد بھی ہے کس سے کہوں میں حالِ دل
ہوتی جو ایک شب کی بات کرتا فغاں تمام رات

بھولے گی اس کی یاد کیا، تازہ رہے گی حشر تک!
پائی جو میں نے لذّتِ دردِ نہاں تمام رات

جاری تھا اس کا سلسلہ شمعِ الم کے ساتھ ساتھ
کرتا رہا بشوق میں ذکرِ بُتاں تمام رات

ٹوٹے ستم کچھ اس طرح لب تک ہلا سکا نہ میں!
ہائے! بنی رہی عدو برقِ طپاں تمام رات

شامِ الم میں بھی رہا تسکیں سکوں نصیب میں
چہرے پہ آسکا نہ کچھ غم کا نشاں تمام رات ★

ڈوبی ڈوبی سی ہے نشّے میں فضا آج کی رات
بیخودی میں نہ ہو مجھ سے بھی خطا آج کی رات

بہکی بہکی ہے اُمنگوں کی ادا آج کی رات
ساقیا! اور پلا، اور پلا، آج کی رات

کس کی آمد پہ ہے سرشار فضا آج کی رات
آ رہا ہو نہ کوئی مست ادا آج کی رات

اِن گھٹاؤں کی اداؤں کو تو دیکھے کوئی!
لے نہ ڈوبے کہیں مجھ کو یہ گھٹا آج کی رات

جن سے آشفتہ سری ہو مری تسکین طلب
ایسے نغمات بھی چھیڑو تو ذرا آج کی رات

حاجتِ چارہ گری مجھ کو نہیں چارہ گرو!
درد بن جائے گا خود دل کی دوا آج کی رات

جس کی زد سے تھا بہت دُور سفینہ تسکیں
ہے وہی پیشِ نظر موجِ بلا آج کی رات ★

(٣٩)

روکشِ عہدِ غم ہے ساقی تیرے میخانے کی بات
میری آنکھوں سے عیاں ہے تیرے پیمانے کی بات

دیکھتے ہی دیکھتے دِل مضطرب ہوتا گیا!
اُن پہ روشن ہو گئی یوں دل کے آجانے کی بات

کِس سے کہیئے حالِ دل، رودادِ غم، فرقت کی شب!
شمع ہی کچھ جانتی ہے رات کٹ جانے کی بات

ہاں! ہمیں کچھ جانتے ہیں، غیر کیا جانے اسے!
تیرے ترڑپانے کا عالم، تیرے ترڑپانے کی بات

کیا مِلا ہے تیرے پیمانے میں اے ساقی بتا!
کاش سمجھا دے مجھے تو ہوش میں آنے کی بات

جی نہیں لگتا کسی عنواں، کسی جا، اِن دنوں!
سوچتا رہتا ہوں پہروں دِل کے بہلانے کی بات

فاش ہونا ہی تھا اے تسکینؔ اِک دن رازِ غم!
کب تلک پوشیدہ رہتی اشک پی جانے کی بات ★

جھونکے تھے غم کے باغ میں طوفان کی طرح
سُنبل صفت تھے ہم کبھی ریحان کی طرح

بَدقسمتی کا اپنی ستارہ ہے اوج پر
مِلتے ہیں اب تو دوست بھی انجان کی طرح

موجِ بلا تھی اور تھی تنہا بس اپنی ذات
اپنی جگہ ہم آپ تھے چٹّان کی طرح

سَر ہوگا کیوں نہ منزلِ غم کا بھی معرکہ
ہے جذبہ اپنے عزم کا ایمان کی طرح

جس بات سے نہ ہوتی ہو تکمیلِ آرزو!
وہ بات دل میں پَلتی ہے طوفان کی طرح

آتی ہو جس کے نام سے انسانیت پہ آنچ
انساں وہی ہے آج کا حیوان کی طرح

پردے میں جن کے حدِّ نظر تک سراب تھا
کھائے ہیں وہ فریب بھی نادان کی طرح

ٹوٹے گا تا بکئے نہ طلسمِ فریب وہ!
نازاں ہیں جس پہ نخوتیں شیطان کی طرح

ایذا رساں کہاں رہی اب دشمنوں کی چال
پیچھے پڑے ہیں دوست ہی سرطان کی طرح

تسکیں وہ پہلی بات، وہ رونق کدھر گئی
کیوں شہرِ دل یہ تیرا ہے شمشان کی طرح

(۱۴)

حاصل سکوں ہوا ہے غمِ معتبر کے بعد
نسخہ لگا ہے ہاتھ بڑے دردِ سر کے بعد

امّیدِ صبحِ نو میں گذاری تمام رات
تاریکیاں وہی رہیں لیکن سحر کے بعد!

اللہ رے اضطراب کا عالم شبِ فراق
کچھ ہم ہی جانتے ہیں جو ہوگا سحر کے بعد

اُن سے نظر ملی کہ ملی برق سے نظر
پھر کس کو آ گئے ہوش تھا اتنی خبر کے بعد

اے برق کیوں چمکتی ہے گلشن میں بار بار
اب کس پہ ہوگا تیرا کرم میرے گھر کے بعد؟

اتنا بتا دے جاتے ہوئے اے شبِ فراق
کیا ہوگی دُور دل کی خلش بھی سحر کے بعد؟

میرے سرشکِ غم سے ہے شادابیِٔ وفا
سرسبز یہ چمن ہوا خونِ جگر کے بعد

مانا کہ صبح و شام ہیں مِنّت کشِ فلک
پھر کیا کرے گا آسماں شام و سحر کے بعد!

تسکیںؔ کی شاعری تو ہے مِنّت پذیرِ فن
جوہر کھُلیں گے شعر کے نقد و نظر کے بعد!

★
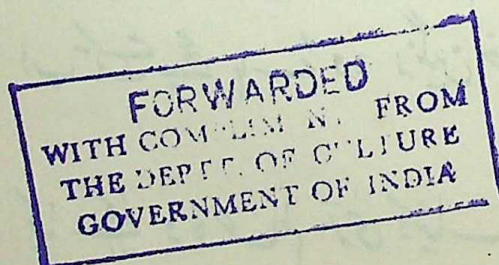
کچھ مہر و وفا یاد، نہ کچھ جور و جفا یاد
کیا! اُن کے سوا مجھ کو رہا نامِ خدا یاد

کہنے کو تو کچھ بھی نہیں اے جانِ وفا یاد
لیکن ہیں ترے گیسو و رُخ صبح و مسا یاد

رہتا ہے سدا غنچۂ خاطر مرا مضطر
شاید کہ ہے کلیوں کے چٹکنے کی صدا یاد

مدّت ہوئی نظروں کے تصادم کو بھی لیکن
اب تک ہے مجھے ہائے وہ رنگین خطا یاد

کیا کہیے وہ عالم تری دُنیائے ادا کا
آتی رہی مجھ کو تری ہر طرزِ ادا کا

ہوتی رہی تکمیلِ تمنّا سرِ مقتل!
اِس شان سے آتی رہی قاتل کی ادا یاد

کُشتوں کو ترے دامِ فنا سے ہے غرض کیا
ڈرتے نہیں عشّاق کبھی کر کے فنا یاد!

آلام و مصائب ہوئے تسکین کے ضامن
پھر کیوں نہ ہوں مجھ کو وہی لمحاتِ سزا یاد

(۴۳)

ہم خیال اُن کو بنائیں تو بنائیں کیوں کر
آتشِ غم کو بجھائیں تو بجھائیں کیوں کر

دُور اُفتادہ ہیں ہم تیری نظر سے ساقی
تشنگی دل کی بجھائیں تو بجھائیں کیوں کر

شمعِ حسرت ہے جہاں، یاس کا طوفاں ہے وہیں
ہم اگر اس کو جلائیں تو جلائیں کیوں کر

جن کی یادوں سے منوّر ہے یہ کاشانۂ دل
ہائے! ہم ان کو بھلائیں تو بھلائیں کیوں کر

آتشِ غم کہیں اشکوں سے بھی ٹھنڈی ہوگی
سوزِ پنہاں کو بجھائیں تو بجھائیں کیوں کر

برق ساماں ہے فلک تو یہ زمیں ہے دشمن
آشیاں اپنا بنائیں تو بنائیں کیوں کر

جلوہ افروز تجھے دیکھ کے حیران ہیں ہم
دامنِ ہوش بچائیں تو بچائیں کیوں کر

کب ملا اپنے سفینے کو بھی ساحل تسکیں
بختِ خفتہ کو جگائیں تو جگائیں کیوں کر

آئینۂ خیال ہے شام و سحر سے دُور
جلوہ نہ اُن کا رہ سکا میری نظر سے دور

اے برق پا سکے گی نہ جس کا سراغ تو
وہ آشیاں بنائیں گے تیری نظر سے دور

امواجِ حادثات کے احسان ہی تو ہیں
طوفانِ غم رہا نہ ہماری نظر سے دور

کھایا کئے فریب ہم اپنی نظر کے آپ
مایوسیاں بھی کب تھیں فریبِ نظر سے دور

جس رہگذر میں ہم رہے بربادِ آرزو
تا عمر رہ سکے نہ ہم اُس رہگذر سے دور

آئینۂ نشاط کہ جس میں ہے تیری شکل
کب چاہتا ہوں میں کہ ہو میری نظر سے دور

گھر اُس کی شکل کر گئی کچھ دل میں اس طرح
وہ ماہوش نہ رہ سکا پھر میرے گھر سے دور

تسکیں ترے حریف بھی دل سے ہیں معترف
ہیں شعر تیرے کاوشِ نقد و نظر سے دور

کرنا تھا ستم اُن کو تو کرتے وہ ستم اور
کیا چاہتے ہم ان کے سوا اُن کی قسم اور

حاصل رہے دل کو جو مرے ضبطِ الم اور
آنکھیں مری طوفانِ ستم میں نہ ہوں نم اور

ہاں! بحرِ مصائب میں بھی کیا شکوۂ طوفاں
سہنے ہیں ابھی مجھ کو تو کچھ رنج و الم اور

بکھرے ترے رُخ پر جو کبھی گیسوئے شبگوں
میرے لئے پیدا ہوئی اِک شامِ الم اور

آساں نہیں اس راہ میں کچھ راہ روی بھی
ہستی کی گذرگاہ ہے کچھ راہِ عدم اور

اُٹھتے ہی رہے فتنۂ اوہام پرستی!
ڈھلتے رہے ہر لمحہ یہاں دیر و حرم اور

نظّارہ ہو جلووں کا جو اِک بار بھی تسکیں
تا عمر نہ ہو دل کو تمنّائے اِرم اور ★

کیا کرے پامالِ حسرت بزمِ عشرت دیکھ کر
زخمِ دل خنداں ابھی ہے گُل کی صورت دیکھ کر

حُسن خود معکوس تھا، یا آئینہ معکوس تھا!
دونوں تھے اک دوسرے کو محوِ حیرت دیکھ کر

دیکھنا پھر بیٹھے بیٹھے تم چراغاں کی بہار!
کاش ٹوٹیں چار تارے میری تربت دیکھ کر

تیرا جلوہ ہے نہاں ہو کر عیاں کچھ اس طرح!
محوِ حیرت کیوں نہ ہو دل شرحِ جلوت دیکھ کر

چاک ہوتے ہی گئے پردے حریمِ ناز کے
چشمِ بینا دیکھ کر، اہلِ بصیرت دیکھ کر!

جب ہنسی آئی تو آنکھیں بھی ہوئیں پُرنم مری
کی گئی ہے یہ ودیعت ظرفِ فطرت دیکھ کر

اِک چراغِ گور سے بس نام روشن ہے مرا
بیکسی بھی ورنہ روتی سونی تربت دیکھ کر

سرنگوں آخر ہوئے تسکیںؔ تیرے سب حریف
تیری نصرت دیکھ کر، اپنی ہزیمت دیکھ کر!

ویرانی سی ہے میکدے میں برہمی تیرے بغیر
ساغر و صہبا میں کیا ہو دلکشی تیرے بغیر

شامِ غم گھیرے ہے کب سے آ بھی جا اے ماہ وش
غمکدے میں کس طرح ہو روشنی تیرے بغیر

شاد تھے ہم بھی کبھی گلزارِ اُلفت میں ندیم!
اب تو کھلتی ہی نہیں دِل کی کلی تیرے بغیر

یوں تو روتا ہی رہا ہوں مثلِ شبنم عمر بھر
جب ملے موقع تو کیا آئے ہنسی تیرے بغیر

عید تھی موقوف تیری دید پر اپنی کبھی
اب تو حاصل ہی نہیں ہے وہ خوشی تیرے بغیر

تا سکے تڑپوں غمِ فرقت میں بھی میں رات دن
کاٹنی دوبھر ہے اب تو زندگی تیرے بغیر

چھا گئی ہے خامشی ہر سو فضائے دہر میں
پا رہا ہوں سازِ اُلفت کی کمی تیرے بغیر

تُو جو آ جائے تو ہو تسکین کو تسکین نصیب
مٹ نہیں سکتی ہے ورنہ بیکلی تیرے بغیر

★

قوتِ فکر بہ اندازِ دگر پیدا کر
جس سے گرویدہ جہاں ہو وہ اثر پیدا کر

شامِ فرقت میں بھی تو نورِ سحر پیدا کر!
اشک کے بدلے اِن آنکھوں سے گہر پیدا کر

ذوقِ نظّارہ سے پھر برقِ نظر پیدا کر
تنکے تنکے سے نشیمن کے شرر پیدا کر

ہو زمانے کی نظر جس کی چمک سے حیراں
کوئی ایسا بھی درخشندہ قمر پیدا کر!

چاک کردے جو حجابات کے سارے پردے
اُس کو ہر شئے میں جو دیکھے وہ نظر پیدا کر

کُشتۂ ناز کو کیا دامِ فنا سے مطلب!
موت سے کہدے کہ تو دوسرا گھر پیدا کر

جس سے مائل ہو زمانہ تری جانب تسکیںؔ
دستِ ہمّت سے وہ تابندہ گہر پیدا کر ★

سہوں گا میں زمانے کی بھی آخر سختیاں کب تک
نہ ہوگا تیری زُلفوں کا بھی سایہ جانِ جاں کب تک

رہوں میں مضطرب اَے انقلابِ آسماں کب تک!
ملے گا بے زبانی کو مری رنگِ فغاں کب تک!

رہے گا برق کی زد میں ہمارا آشیاں کب تک
نہ ہوگا سایۂ رحمت بھی اس پہ مہرباں کب تک

تپِ غم سے لہو بن جائے گا اِک دن جگر اپنا
رہے گی راز داں بن کر بھی چشمِ خونفشاں کب تک

نہ بن جائے کہیں حرفِ شکایت یہ حقیقت بھی!
زباں رکھتے ہوئے لیکن نہ کھولوں میں یہاں کب تک

اِدھر ساماں ہیں تنکوں کے، اُدھر ہے برق سامانی!
رہے گا آسماں آخر حریفِ آشیاں کب تک!

کسی دن تو فروزاں اپنی شمعِ آرزو ہوگی!
نہ ہونے دیں گی روشن وقت کی یہ آندھیاں کب تک!

مسرت کی کرن پھوٹے عجب کیا شامِ غم سے بھی!
رہے گا آخرش کوئی یہاں حرفِ فغاں کب تک!

ہیں بحرِ ہستی کی امواج اِک اِک حبب فنا ساماں
رہے سالم یہ تسکینِ کشتیٔ عمرِ رواں کب تک!

★

ستم ڈھائے تو اُس نے بے شمار اوّل سے آخر تک
مرے دِل کو رہا لیکن قرار اوّل سے آخر تک

عطا کر ساقیا مجھ کو شرابِ اِتقا ایسی
نہ رُلوائے کبھی جس کا خمار اوّل سے آخر تک

کبھی خنداں، کبھی گریاں، کبھی اِک طائرِ مضطر
رہا دل پر مرا کب اختیار اوّل سے آخر تک

نہ آنے کی اُدھر دل میں تو اُس نے ٹھان رکھی تھی
اِدھر کرتا رہا میں انتظار اوّل سے آخر تک

لکھی تھی کیسی محرومی مری فردِ مقدّر پر
رہی رُوپوش ہی مجھ سے بہار اوّل سے آخر تک

سے چلے جائیں جو تیری انجمن سے آج مستانے
رہے پھر شمعِ محفل اشکبار اوّل سے آخر تک

مری بیتابیوں پر کیوں زمانہ آج خنداں ہے
اُسے بھی کب ملا چین و قرار اوّل سے آخر تک

سنوار اے تو گیسوئے فصلِ گُل تو اے تسکیں
پریشاں ہی رہی لیکن بہار اوّل سے آخر تک

★

(۵۱)

ترا لطفِ دلنوازی جسے ہر قدم ہو حاصل
اُسے فکرِ دو جہاں کیا، اُسے کیا غمِ منازل!

مِلا کیفِ زندگانی مجھے آنسوؤں کو پی کر
مجھے ہر خوشی ہے حاصل ترا غم ہے جبکہ شامل

مرے آنسوؤں میں مضمر ترے غم کا ہے فسانہ
ترے غم کی جھلکیوں سے ہے امیدِ صبحِ منزل

نہیں ہیں وہ موجِ غم ہوں جو ہو طالبِ کنارا
یہاں ڈھونڈتی ہے کب سے مجھے خود نگاہِ ساحل

مری دسترس کی ہر شئے یہاں چھن گئی ہے مجھ سے
کہیں غم بھی چھن نہ جائے جو ہے زندگی کا حاصل

ہوئی وجہ کامرانی مری بے کلی ہی لیکن
یہ خلش اگر نہ ہوتی یہی زندگی تھی مشکل

(۵۲)

نظر سے نظر کا ملانا بھی مشکل
مئے عشق پینا پلانا بھی مشکل

ہر اک سمت کانٹے ہیں جب اس چمن میں
تو پھر ان سے دامن بچانا بھی مشکل!

یہ مانا کہ غم زندگی ہے مری جاں
مگر بارِ غم کا اُٹھانا بھی مشکل

عجب کیا، ملے لذّتِ سوزِ پنہاں!
مگر زخمِ مژگاں ہے کھانا بھی مشکل

منوّر اِسی سے ہے کاشانۂ دل
مگر داغ پر داغ کھانا بھی مشکل

وہ آنسو جو ہیں رازدارِ محبّت
اُنہیں اپنے دامن پہ لانا بھی مشکل

ازل سے اَبد تک جو مخفی ہی مخفی
اُسے پائے گا کون، پانا بھی مشکل

شبِ غم میں عالم جو دیکھا ہے دل کا
بتائیں بھی کیا ہم، بتانا بھی مشکل

ملی دعوتِ جلوۂ طور تو کیا!!
کہ ہے تابِ نظّارہ لانا بھی مشکل

تجھے پاسِ آدابِ اُلفت ہے تسکینؔ
ترے سامنے اُن کا آنا بھی مشکل

(۵۳)

ملا نہ جادۂ منزل تو کیا ملے منزل
ہر ایک موڑ پہ ملتے گئے ہمیں قاتل

ملا نہ کوئی ہمیں ایسا رہبر کامل
کہ جس کے سائے میں آساں ہو منزلِ مشکل

غریقِ بحرِ الم خود کو یوں ہی رہنے دو
ملے ملے نہ ملے تم کو دامنِ ساحل

نمودِ صبح سے معدوم ہے سیاہیِ شب
ٹھہر سکا نہ کبھی حق کے روبرو باطل

تمہارے شہر کے انداز کا بھی کیا کہنا
جگہ جگہ نظر آئے نئے نئے قاتل

انہیں کے ہاتھوں حنابندئ گلستاں ہے
روش روش پہ جو کرتے ہیں نذر خونِ دل

کہیں ہے تشنہ لبی اور کہیں ہے مدہوشی
اِسی نظام پہ نازاں ہے ساقئ محفل

اُداس اُداس ہے تسکیں، خوشی سے بیگانہ
فضائے دہر نے رکھا کسے یہاں خوشدل

طاری ہے بے خودی کا کچھ ایسا مجھ پہ عالم
دُنیائے دل کا اپنی کرتا ہوں آپ ماتم

پوچھے نہ کوئی مجھ سے میرے جنوں کا عالم
ساحل کی آرزو میں موجوں کے لے لئے غم

پھولوں کی زِندگی پر ہے اشک ریز شبنم
بخشی گئی ہے جس کو اُن سے بھی زندگی کم

مجھ سا بھی کون ہو گا ہیاں باز اِس جہاں میں
اِک تیرے غم کی خاطر دنیا کے لے لئے غم

ہر گام پر مسرّت، ہر گام پر اذیّت
وہ رنج ہو کہ راحت، آنکھیں سدا ہیں پُرنم

حاصل ہے سرفرازیِ نامِ خدا اُسی کو
ہے دسترس میں جس کی انسانیت کا پرچم

اے حُسنِ خود نگر تو غافل رہے گا کب تک
شمعِ وفا کی لَو بھی اب ہو چلی ہے مدّھم

بیشک ہے خوش نصیبی اُس آدمی کی تسکیں
قدموں میں جس کے آئے خود کھنچ کے منزلِ غم

★

(۵۵)

رکھتے ہیں واسطہ جو ترے آستاں سے ہم
ہر لمحہ بے نیاز ہیں دونوں جہاں سے ہم

رفعت ہمارے جذبۂ دل کی تو دیکھئے
اُمّیدِ مہر رکھتے ہیں کِس مہرباں سے ہم

کردے حریمِ ناز کے پردے جو چاک چاک
ایسی نظر بھی لائیں تو لائیں کہاں سے ہم

ہم تو فریب خوردۂ منزل ہی رہ گئے
آئے وہیں پہ چل کے چلے تھے جہاں سے ہم

سرسبز کردے نخلِ تمنّا جو رفعتؔ
اتنا اثر بھی لائیں دُعا میں کہاں سے ہم

کیا جانے ، اپنی دُھن میں کہاں سے کہاں گئے
یا کارواں ہی آگے تھا یا کارواں سے ہم

بیگانۂ خودی کا ہو گلشن میں کیوں قیام
لے باغباں ، چلے کہیں اِس گُلستاں سے ہم

تسکیں زباں بن گئی جب اپنی خامشی
پھر کام کیوں زباں کا نہ لیں اب زباں سے ہم

(۵۶)

بھول کر کچھ دورِ ماضی کے حسین کردار ہم
آدمیّت کا گرا دیں گے بھی کیا معیار ہم!

تیری دُنیا سے چلے ایسے ہوئے بیزار ہم
کیا کہے گا تو بھی ظالم کیسے ہیں خوددار ہم

انجمن میں اپنی تو اک نغمۂ جاں بخش ہے
دشت و صحرا میں ہیں ٹوٹے ساز کی جھنکار ہم

تیری محفل میں چراغاں ہی چراغاں کی بہار
اپنے غم خانے میں گوندھیں آنسوؤں کے ہار ہم

گلشنِ عالم میں ہستی آپ کی نورس کلی
برگِ پامالِ خزاں ہیں دہر میں سرکار ہم!

شامِ غم بھی ہے لئے صبحِ مسرّت کی کرن
تیرگی میں دیکھتے ہیں نُور کے آثار ہم!

آمدِ فصلِ بہاراں کا یقیں آئے ذرا!
کر کے رکھ دیں گے گریباں کا بھی اِک اِک تار ہم

تابکے ہوگا گریزاں، اے زمانہ ہم سے تُو
ڈھال دیں گے اپنے سانچے میں تری رفتار ہم

جس کی یک رنگی پہ نازاں خود ہے صنّاعِ ازل
منزلِ کُن میں ہیں وہ نقشِ سرِ دیوار ہم

رشک سے دیکھیں نہ کیوں اہلِ نظر تسکیں ہمیں
کیا محیطِ فکر سے لائے دُرِ شہوار ہم

(۵۷)

خود کو رضائے حق پہ فدا کر چکے ہیں ہم
حق بندگی کا اپنی ادا کر چکے ہیں ہم

خود کو نثارِ شمع وفا کر چکے ہیں ہم
ہموار اپنی راہِ بقا کر چکے ہیں ہم

موجوں سے ہمکنار، تو طوفاں سے ساز باز
کچھ ایسی سازگار فضا کر چکے ہیں ہم

کیوں زلفِ شامِ غم بھی نہ آئے ہمارے ہاتھ
اِک آہِ نارسا کو رسا کر چکے ہیں ہم!

مرہم سے عہدِ نَو کے بھی کب ہوگا مندمل
رہ رہ کے زخمِ دل تو ہرا کر چکے ہیں ہم

معلوم ہے! کرے گی جو ہم سے بھی یہ نباہ
گو عمرِ بے وفا سے وفا کر چکے ہیں ہم

یوں رکھ رہے ہیں پھونک کے اِک اِک قدم یہاں
جیسے قدم قدم پہ خطا کر چکے ہیں ہم

ممکن نہیں رہائی اب اس قید و بند سے
جس کی حدوں سے خود کو رہا کر چکے ہیں ہم

تسکینؔ حادثات کا کیا خوف اب ہمیں
دل کو حریفِ موجِ بلا کر چکے ہیں ہم

★

(۵۸)

ترے جلووں کو ہم تو آرزوئے دل سمجھتے ہیں
مگر نظّارگی اُن کی ذرا مشکل سمجھتے ہیں

رہے تا عمر یہ محفوظ بھی تو اپنے سینے میں
تری تصویرِ غم کو کائناتِ دل سمجھتے ہیں

ہماری کشتیٔ اُمّید کا انجام کیا کہیئے
کہ ہر موجِ بلا کو مستقل ساحل سمجھتے ہیں

سفینہ زد میں گردابِ بلا کی آگیا تو کیا
کہاں مشکل کو بھی نامِ خدا مشکل سمجھتے ہیں

بھرم کیوں عشق کا کھوئیں ہم اُن کی بزم میں جاکر
تری وارفتگی کو کچھ ہمیں اَے دل سمجھتے ہیں

ہماری تشنگی پر یہ تو اک طنزِ مسلسل ہے!
تبسّم کو ترے اَے سَاقیٔ محفل سمجھتے ہیں

ہمارا شوق بھی کب پائیہ تکمیل تک پہنچا!
ہم اپنے آپ کو گمُ کردۂ منزل سمجھتے ہیں

یہی بیتابیاں تو حاصلِ الفت ہیں اَے تسکیں!
خوشا قسمت! انہیں تو ہم سکونِ دل سمجھتے ہیں

(۵۹)

سر بکف اب جنوں ہے تو قاتل نہیں
رنگِ مقتل ہے پھیکا کہ بسمل نہیں

طالبِ مقصدِ زندگی کے لئے
شرط ہے رہروی، دور منزل نہیں

موجِ گردابِ بحرِ غمِ عشق ہوں
میری قسمت میں طوفاں ہے، ساحل نہیں

ہم ہلا دیں گے بنیادِ ایوانِ شر
ہے صدا حق کی، یہ زعمِ باطل نہیں

انجمن یوں تو کتنی ہی سج دھج کی ہیں
جس میں ہوتے نہیں تم وہ محفل نہیں

جس سے ہوتی ہو تخلیقِ انسانیت!
موجزن میرے سینے میں وہ دل نہیں

اُس صدف پر تاسّف نہ کیوں کیجئے
دُرِّ شہوار بھی جس کو حاصل نہیں

چھٹ ہی جائے گا ابرِ الم ایک دن
ہاں بدلنا فضاؤں کا مشکل نہیں

کس طرح فصلِ گُل کا یقیں ہو مجھے
نغمہ زَن جب چمن میں عنادل نہیں

کھویا کھویا رہا میں تری یاد میں!
محویت تو رہی، وحشتِ دل نہیں

دیں گے تسکین اوروں کو تسکین کیا
جبکہ تسکین خود ان کو حاصل نہیں

★

(۶۰)

جلووں میں اُن کے گم ہیں میری نظر کی باتیں
بیخود بنا رہی ہیں نورِ سحر کی باتیں

دیکھی ہوں میں نے جیسے فردوس کی بہاریں
کیا کیا تھیں کیف ساماں ان کی نظر کی باتیں

طے ہو گئے منازل اُلفت کی رفعتوں کے
پہنچیں جو اُن کے دل تک میری نظر کی باتیں

آنکھوں سے منکشف ہے روداد غم ہماری
تا چند چھپ سکیں گی سوزِ جگر کی باتیں

اَے گردشِ زمانہ تجھ کو سلام میرا
اب ختم ہو چکی ہیں شام و سحر کی باتیں

جس رہگذر میں اپنے ارماں کا خوں ہوا ہے
وجہِ نشاطِ دل ہیں اُس رہگذر کی باتیں

گلشن کی ہر روش پر یوں رہ گیا میں ساکت
یاد آ رہی ہوں جیسے زخمِ جگر کی باتیں

انجان سی خلش اِک دل میں ہے موجزن کیوں
راس آ گئیں ہیں دل کو کِس بے خبر کی باتیں

اے ضبطِ غم خدارا اب لاج میری رکھنا
ڈر ہے کہ کھُل نہ جائیں حُسنِ نظر کی باتیں

یوں روبرو تھا جلوہ کِس ماہ وش کا لیکن
آنکھوں میں پھر گئی ہوں جیسے سحر کی باتیں

(۶۱)

گرمیٔ آہ سے پگھلے جو سلاسل اِکدن
تیرے دیوانے کو مِل جائے بھی منزل اکدن

گرم بازاریِ مقتل بھی رہیگی کب تک
شَل نہ ہو جائے کہیں بازوئے قاتل اکدن

سوز خوانی کا جو اُن کی یہی عالم ہوگا!
خاک کر دیں گے گلستاں کو عنادل اکدن

حقّ و باطل کا بھی مِٹ جائیگا جھگڑا ہمدم!
سر اُٹھائے گی نہ پھر شورشِ باطل اکدن

کم نگاہی تری یونہی جو رہی اَے ساقی
ماند پڑ جائے گی یہ رونقِ محفل اِکدن

جذبۂ دل کی کوئی بات نہ پوچھے مجھ سے
خود ہی یہ سیلِ اَلم میں ہوا شامل اِک دن

بحرِ آلام میں ہمّت جو سہارا دیتی
پھر تو ہر موج میں ہم دیکھتے ساحل اِک دن

اِس توقّع پہ تو ایمان ہے اپنا تسکیں
خود ہی ہو جائے گا حل عقدۂ مشکل اِک دن

(۶۲)

میں نے دیکھا تو کبھی ایسا تماشا ہی نہیں
صبح تو ہو گئی، معلوم اندھیرا ہی نہیں

تیری آواز پہ لبیک تو کہنے کو تھے ہم
اے غمِ وقت ہمیں تو نے پکارا ہی نہیں

ایسی برسات کبھی پہلے تو دیکھی نہ گئی
اشکِ غم ہے کہ چلا آتا ہے رکنا ہی نہیں

رہگزر میں تری کتنے ہی مقام آئے مگر
کارواں ذوقِ نظر کا کہیں ٹھہرا ہی نہیں

ایک حالت پہ رہے اپنی بھی حالت تو کہوں
روگ وہ مجھ کو لگا جس کا مداوا ہی نہیں

سنتا آیا ہوں کہ امید پہ قائم ہے جہاں
مجھ کو ایسا کوئی تارا نظر آتا ہی نہیں

کیجئے کس سے بیاں کیفیتِ قلبِ تپاں
دل ہے پہلو میں کہ سیماب ٹھہرتا ہی نہیں

ہوں گے وہ اور چلیں گے جو اشارے پہ ترے
تُو نے اے گردشِ دوراں ہمیں جانا ہی نہیں

کیا ملے اپنے سفینے کو بھی ساحل تسکیں
ہائے اِس بحرِ الم کا تو کنارا ہی نہیں!

۶۳

ہر صبح ہماری صبح نہیں، ہر شام ہماری شام نہیں!
اے گردشِ قسمت کیا کہیئے، رونے کے سوا کچھ کام نہیں

تا عمر اسیرِ رنج و الم، تا عمر خوشی کا نام نہیں
کیا لے کے مقدر آئے ہیں، اک پل بھی ہمیں آرام نہیں

اے شانِ کریمی تو ہی بتا، کیا ہوگا مآلِ رنج و الم
معلوم ہمیں آغاز تو ہے، معلوم مگر انجام نہیں

اک ہم ہی نہیں ہیں تشنہ دہن، ہم جیسے یہاں کچھ اور بھی ہیں
اے ساقیِ محفل کیا ہے ستم، کیوں فیض بھی تیرا عام نہیں

اے چارہ گرو بس رہنے دو، تم سے تو نہ ہوگی چارہ گری
اب درد ہی اپنا درماں ہے، اب درد کا مطلق نام نہیں!

مخصوص ہے اُن کی جلوہ گری، مخصوص ہے تابِ نظّارہ
کر لے جو نظارہ جلووں کا ہر فرد و بشر کا کام نہیں!

ناکامیِ قسمت کا رونا بے سود یہاں ہے اے تسکیں
ناکامِ تمنّا اور بھی ہیں، اِک ہم ہی فقط ناکام نہیں ★

(٦۴)

لاکھ کہیئے، مگر بہار نہیں
حق کے کہنے میں مجکو عار نہیں

شمعِ محفل نہ جانے کب گُل ہو
بزمِ ہستی کا اعتبار نہیں

رازِ گلشن بھی کیا رہے مخفی
بوئے گُل جب کہ رازدار نہیں

سہہ رہا ہوں ستم زمانے کے
دامنِ صبر تار تار نہیں!

بارِ غم سے ہوں آشنا ایسا
بارِ غم جیسے مجھ پہ بار نہیں

رشکِ گلزار ہیں یہ داغِ دل
ایسی گلشن میں بھی بہار نہیں

حرفِ شکوہ لبوں پہ کیوں لائیں
عاشقی وجہِ انتشار نہیں

لذّتِ زیست کیا اُسے حاصل
رنج و غم سے جو ہمکنار نہیں

ضبطِ اشکِ الم ہے کیا کم ہے
رازِ اُلفت تو آشکار نہیں

ایک دو ہوں تو میں کہوں تسکیں
حسرتوں کا مری شمار نہیں

(۶۵)

سچ کا وہ دل میں یقیں لاتے نہیں
جھوٹ کی تردید فرماتے نہیں

یاس کا غلبہ ہے کب سے آپ پر
اس پہ غالب آپ کیوں آتے نہیں!

پُرکشش کتنا تھا کل کا آئینہ
آج اُس کا شائبہ پاتے نہیں!

پیچ و خم سے راہ کے جو ڈر گئے
منزلِ مقصود وہ پاتے نہیں!

سر پہ جس کے تاجِ نخوت کا رہا
اُس کو خاطر میں تو ہم لاتے نہیں

۱۱۷

کار فرما ہیں زمانے کے ستم
خود کو ورنہ مضطرب پاتے نہیں

عصرِ حاضر کے بھی کیسے ساز ہیں
دل کو ان کے راگ بَرماتے نہیں

اب وہ گُلشن ہے نہ وہ رعنائیاں
دُور تک اُن کا نشاں پاتے نہیں

عہدِ رفتہ کے وہ منظر کیا ہوئے
ذہن میں وہ پھُول اب آتے نہیں

مائلِ تسکیں ہیں جن کے حوصلے
وہ فریبِ غم کبھی کھاتے نہیں

دیکھی ہے ہنسی یوں تو گُلوں کی بھی چمن میں
وہ بات کہاں پائی جو اُس غنچہ دہن میں

معلوم نہیں، صرفِ فغاں کیوں ہیں عنادل
اِس طرح چمن میں ہیں، نہیں جیسے چمن میں

کیوں داخلِ شکوہ ہوئی حق گوئی بھی میری!
کیا رکھتا نہیں میں ہی زباں اپنے دہن میں؟

لگتی ہے سدا چوٹ وہیں زخم جہاں ہے
ہر روز نیا زخم ہے، اِک زخمِ کہن میں

گُم دونوں سرے جس کے ہوں کیا ہوگی کہانی
افسانہ ادھورا ہی رہا میرا چمن میں

تنظیمِ گُلستاں کی ہے بُنیاد ہمیں سے
شادابیٔ گلشن ہے نہاں تارِ کفن میں

کُشتوں کو ترے دامِ فنا سے ہے غرض کیا
روپوش کہیں ہوتے ہیں یہ گور و کفن میں!

کمُھلا گئی کِھلتے ہی کلی دِل کی جو تسکیں
شاداں نہ رہے کہنے کو ہم باغِ سخن میں

۶۷

ہر نغمگی تو داخلِ آدابِ فن نہیں
تڑپائیں جو نہ دل کو وہ شعر و سخن نہیں

گلچیں کا ساتھ دیتا ہوں ہنس ہنس کے اس طرح
معلوم جیسے مجھ کو ہے رنگِ چمن نہیں

کُنجِ قفس سے چھُٹ کے بھی شاداں نہ رہ سکا
کچھ آئی راس مجھ کو فضائے چمن نہیں

کیوں عندلیبِ گلشنِ عالم ہیں نالہ کش
موسوم جو چمن سے ہے شاید چمن نہیں

ہر سانس میرے حق میں ہے اک وجہِ اضطراب
آہ و فغاں کی تاب بھی اب جانِ من نہیں

ذاتِ شہید ناز ہے پھولوں سے بھی سوا
زیرِ لحد اُٹھائے جو بارِ کفن نہیں!

رُوداد کس سے کہیئے بھی آلِ نبیؑ کی اب
مقتل میں اُن سا کوئی بھی تشنہ دہن نہیں!

تسکیں سرشکِ خوں بھی مژہ پر شبِ فراق
منظر تھا کیف زا، جو سرِ انجمن نہیں!

★

رند کا بھی نام کب ساقی کے دفتر میں نہیں!
رحمتِ باری سیہ کاروں کے کب گھر میں نہیں!

عارضِ رنگیں کے آگے لالۂ و گُل ہیچ ہیں
چُن لیا جو پھُول میں نے گلستاں بھر میں نہیں

کھیلنا موجِ حوادث سے ہے اپنا کام جب
کِس زباں سے ہم کہیں ساحل مقدّر میں نہیں

خون کے آنسو جو روئیں، اُن سے پوچھو حالِ دل
میری رودادِ الم تو دیدۂ تر میں نہیں

دل کی دنیا اور ہے اور سنگ ہے کچھ اور شے
درد کہتے ہیں جسے، دل میں ہے پتھر میں نہیں

چشمِ آہو، تیکھی چتون، ناز و غمزہ، بانکپن!
وصف ہے وہ کون سا، جو اُس ستمگر میں نہیں

جان ہیں دنیائے الفت کی یہی بے تابیاں
کیوں کہے تسکیں سکونِ دل مقدّر میں نہیں

نمایاں فرق او ظالم ہے شیشے اور پتھر میں
کہیں ٹوٹے نہ دل میرا تری باتوں سے دم بھر میں

شبِ غم میں سرشکِ غم بھی اِن آنکھوں سے کیا ٹپکے
ستارے آئے گویا ٹوٹ کر اِس دامنِ تر میں

عجب پُرکیف عالم ہے، عجب اِک بات پیدا ہے
کرن پھوٹی ہے ساقی یا مئے رنگیں ہے ساغر میں

کوئی پی کر تو دیکھے شربتِ دیدارِ دلبر بھی
حلاوت کب ملے گی پھر اُسے تسنیم و کوثر میں

کہیں تیرے شہیدوں کے قریں بھی موت آئے گی
کوئی کہہ دے کرے وہ اپنا ساماں دوسرے گھر میں

تلافی اِس طرح اپنی اسیری کی کروں گا اب
لگا دوں گا تری تصویریں زنداں کے ہر در میں

کہاں اِس میکدے کے جام و مینا پائیں رنگینی
یدِ قدرت نے رنگینی بھری جو چشمِ دلبر میں

سکونِ دل کسی عنواں نہیں حاصل ہے اے تشکیںؔ
ترازو ہوگیا تیرِ نظر کیا قلبِ مضطر میں؟

جہانِ عشق میں مجھ سا کوئی تباہ نہیں
جسے بھی چاہا اُسے چاہ میری آہ نہیں

خدا گواہ ! ذرا اِس میں اشتباہ نہیں
رہا نصیب سے مطلق مجھے نباہ نہیں

کبھی تو بامِ فلک سے یہ آہ ٹکراتی
نہیں ہے چرخ ہی، یا اپنی آہ ! آہ ! نہیں؟

عبث ہے کرنا اُسے زندگی سے بھی منسوب
کسی کی یاد میں جو زندگی تباہ نہیں!

رہِ حیات میں کیوں کارواں رُکے اپنا
بڑھے چلو کہ ابھی منتہائے راہ نہیں

اِسی کو کہتے ہیں شرطِ وفا کہو تو سہی؟
نہیں، کچھ اور ہے، دل کو جو دل سے راہ نہیں

تمہارے حُسن کا پَرتو وجودِ ماہِ تمام
تمہارا جلوہ رہینِ ضیائے ماہ نہیں

اٹھا ہے ابرِ کرم تو ہر اک طرف تسکیں
یہ اور بات ہے، دل مائلِ گناہ نہیں

(۱۷)

منکشف اِک راز خود ہے عالمِ تنویر میں
لَب کُشائی کیا کریں ہم برق کی تشہیر میں!

مانی و بہزاد ششدر رہ گئے یہ دیکھکر
بھر دیا خونِ جگر میں نے تری تصویر میں

جس نے جھیلی ہی نہ ہوں کڑیاں مصائب کی کبھی
کیا وہ جانے کیا ہے میرے نالۂ دلگیر میں

دیکھ لی تصویر جس نے، ہو گیا تصویر وہ
ہائے کس ڈھب کی لگاوٹ ہے تری تصویر میں

نیّتِ بادہ کشی پر یوں گھٹا اُٹھنے لگی
کارفرما جیسے رحمت ہو مری تقصیر میں

ہم ہیں پابندِ سلاسل، لب پہ ہے مُہرِ سکوت
طاقتِ گفتار رکھتے ہیں مگر زنجیر میں!

کی گئی مجھ کو ودیعت اضطرابی کیفیت!
قلب یا سیماب ہے اِس خاک کی تعمیر میں

ہے اِدھر تسکیں سکونِ دل کی خاطر مضطرب
اور اُدھر جنبش پہ جنبش ابروئے شمشیر میں

★

انجمن میں رہ کے بھی ہم انجمن سے دور ہیں
محفلِ عیش و طرب کے بانکپن سے دور ہیں

ہم ہیں مانوسِ قفس اور محوِ تخئیلِ چمن
ارتقائے محویت میں کب چمن سے دور ہیں

نغمہ سنجانِ چمن کیوں نالہ کش ہیں آج کل
ہیں چمن میں اس طرح جیسے چمن سے دور ہیں

تھے برائے نام گرنیاں جاں نثارانِ وطن
وقت آیا تو وہی دار و رسن سے دور ہیں

گریۂ شبنم بھی اب ہے طبعِ نازک پر گراں
کس طرح سمجھیں کہ ہم رنج و محن سے دور ہیں

ہم ہوئے جب آشنائے لذّتِ سوزِ دروں
پھر کہاں امکاں رہا جلوہ فگن سے دور ہیں

کیا نکلنے ہی کو ہے اب آفتابِ انبساط؟
کب سے یہ احساس ہے صبحِ چمن سے دور ہیں

زندگی یا موت ہے، مشکل ہے تسکیں امتیاز
موت سے دوچار ہیں، تارِ کفن سے دور ہیں

یہ مانا کہ صرفِ فغاں اور بھی ہیں
مری طرح کب بے زباں اور بھی ہیں

بتاؤں میں کس شاخِ گل پر نشیمن
تصوّر میں جب گل نشاں اور بھی ہیں

یہ پژمردہ کلیوں سے کہتی ہے شبنم
غمِ عشق کے راز داں اور بھی ہیں

مکاں اُس کے دیر و حرم ہی نہیں ہیں
نظر چاہیئے آستاں اور بھی ہیں

جگہ ہی نہیں لالہ زارِ ستم ہے
رہینِ ستم گلستاں اور بھی ہیں

لگاؤں میں کیوں ساغرِ گُل کو لب سے
کہ سینے میں رازِ نہاں اور بھی ہیں

فقط ذکرِ برق و نشیمن ہی کیوں ہو!
سُنانے کو جب داستاں اور بھی ہیں

برنگِ شفق خونِ ارماں نہیں کچھ
وفاؤں کی کچھ سرخیاں اور بھی ہیں

نظر میں چمن کی رہے اہمیت کیا
برنگِ خزاں گلستاں اور بھی ہیں

تجھی پر یہ کیوں برق گرتی ہے اے دل
چمن میں تو کچھ آشیاں اور بھی ہیں

حریفِ سخن وہ ہیں تسکیںؔ تو کیا غم
مری فکر کے قدر داں اور بھی ہیں ★

خمار آگیں فضا ہے، سو رہا ہوں
کہ اپنے آپ کو مَیں کھو رہا ہوں

نہ پوچھو اضطرابِ قلب مجھ سے
کلی کو دیکھتے ہی رو رہا ہوں

مٹاتے ہیں جو دل کے داغِ عصیاں
اُنہی اشکوں سے دامن دھو رہا ہوں

نہ کیجیے ذکرِ پروانوں کا مجھ سے
میں اُن کی بے کسی پر رو رہا ہوں

اُگے گا کب وہاں نخلِ محبّت
جہاں تخمِ عداوت بو رہا ہوں

یہی بے تابیاں ہیں جانِ تسکیں
سکونِ دل میں خود ہی کھو رہا ہوں

کہنے کی بات ہے کہ یہاں ہے، وہاں نہیں!
رونق فروز کس جگہ وہ جانِ جاں نہیں!

کیوں شاخِ آشیاں کو بناؤں میں گُل نشاں
جب مجھ پہ باغباں ہی مرا مہرباں نہیں

اپنی جبینِ شوق جھکا لوں گا میں کہیں!
کچھ قیدِ آستاں تو مرے مہرباں نہیں!

اب برق کیوں چمکتی ہے گلشن میں بار بار
اک آشیاں تھا اُس کا بھی نام و نشاں نہیں!

ہر سانس میرے حق میں ہے اِک دامِ اضطراب!
آہ و فغاں کی تاب بھی اے جانِ جاں نہیں!

پنہاں ہے تنکے تنکے میں جب برق کا اثر
پھر کیا یقین آئے کہ خطرے میں جاں نہیں

یہ اور بات ہے کہ ضرر سے ہوں بے خبر
کب ورنہ زد میں برق کی یہ آشیاں نہیں

اظہارِ حالِ دل کو وہ سمجھا کریں گلہ!!
اب دل کو میرے ضبط کی تاب و تواں نہیں

کیسی یہ بزمِ ناز ہے، حیرت ہے خود مجھے
جس دل کو دیکھئے وہ یہاں شادماں نہیں

اب کشتۂ الم کو ہو منزل کی کیوں تلاش
اُمّید و آرزو ہی کا جب کارواں نہیں!

جس طرح پُرزے پُرزے ہیں دامانِ آرزو
اِس طرح منتشر تو کوئی داستاں نہیں!

داغِ جفا کے دَم سے ہیں قائم یہ سوز و ساز
کب لُطف زا جگر میں بہار و خزاں نہیں

ایسا بھی غم نصیب نہ تسکین ہو کوئی
مرنے پہ جس کے آج کوئی نوحہ خواں نہیں

۷۶

اُس عارضِ رنگیں کا نقشہ ہم دل پہ اُتارا کرتے ہیں
تصویرِ گلستاں پرور کا خاموش نظارا کرتے ہیں

کیوں شمع کی لَو تھرّانے لگی، کیوں چاند ستارے ماند پڑے
اے سوزِ محبت کیا کہئے، ہم کس سے کنارا کرتے ہیں

اشکوں سے تپش کی چارہ گری، آہوں سے خلش کی دمسازی
اے شامِ مصیبت کیا کہئے، ہم کیسے گذارا کرتے ہیں

اِک لذّتِ پنہاں مرنے میں، اِک کیفِ نمایاں جلنے میں
عالم تہہ و بالا ہوتا ہے، جس دم وہ اشارا کرتے ہیں

دریائے محبّت کا ساحل نظروں سے نہ مخفی ہو کیوں کر
ہم ہیں کہ بڑھے ہی جاتے ہیں، وہ ہیں کہ کنارا کرتے ہیں

نظروں کا تقاضا ہے دل سے کر صبر و سکوں نذرِ مژگاں
سودا تھا بہت مشکل لیکن ہم وارا نیارا کرتے ہیں

رخشندہ ستارے ہوتے ہیں اشکوں کے بھی قطرے مژگاں پہ
تاریکیِ فرقت میں تسکیں، پُر کیف نظارا کرتے ہیں ★

(۷۷)

ترا وجود کہیں آشکار بھی تو نہیں!
نگاہِ شوق کو پل بھر قرار بھی تو نہیں

نظر نظر سے ملی غیر ہو گئی حالت
کچھ ایسا ہوش نہیں! ہاں خمار بھی تو نہیں

تڑپ تڑپ کے قفس ہی میں جان دیتی ہے
یقینِ آمدِ فصلِ بہار بھی تو نہیں!

ہے چاک اپنا گریباں قبائے گُل کی طرح
نہ ہے نصیب کہ یہ تار تار بھی تو نہیں

وہ کیا سُنیں گے جو ہیں محوِ ساغر و صہبا
ہماری آہ صدائے بہار بھی تو نہیں

چمن میں تھا بھی تو لے دے کے اک نشیمن تھا!
اب ایسی کوئی خلش دلفگار بھی تو نہیں

یہ کیا ہوا کہ اُڑی نیند آج آنکھوں سے
کسی کا، دل کو مرے انتظار بھی تو نہیں

ہیں نغمہ سنج ہوں تسکین "آج کاشی" میں
صدائے دل ہے، غزل شاہکار بھی تو نہیں

۷۸

سُرخیاں زخمِ جگر کی جب نمایاں ہو گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے شمعِ شبستاں ہو گئیں

طُور کا جلوہ نہ تھا لیکن تھا کوئی بام پر
دل پریشاں ہو گیا اور آنکھیں حیراں ہو گئیں

بجلیوں کو کیا ہے ایسی ہم سے آخر لاگ ڈانٹ
جب کئے تنکے فراہم فتنہ ساماں ہو گئیں

اس طرف آئی ہنسی اور آبدیدہ ہو گئے!
عشرتیں اور کلفتیں جیسے کہ یکساں ہو گئیں!

شعلہ سامانی ہی دیکھی جس طرف اُٹھی نظر
آنِ واحد میں فضائیں حشر ساماں ہو گئیں

حشر دل کا دیکھئے ہوتا ہے اب تسکین کیا
گرہیں زلفِ یار کی زنجیرِ زنداں ہو گئیں!

۷۹

پھر چاکِ گریبانِ سحر ڈھونڈ رہا ہوں
پھر رازِ مشیّت کی ڈگر ڈھونڈ رہا ہوں

جس ساز کی آواز پہ دل جھوم اُٹھا تھا
اُس ساز کا وہ شوخ اثر ڈھونڈ رہا ہوں

فتنے نہ جہاں جاگتے ہوں دَیر و حرم کے
مدّت سے وہی راہ گذر ڈھونڈ رہا ہوں

تُم ہو کہ تمہاری ہے وہی برق نگاہی
میں ہوں کہ وہی برقِ نظر ڈھونڈ رہا ہوں

سُنتا ہوں کہ قاتل اِسی مقتل میں کہیں ہے
ہر سمت تو میں اُس کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں

گُم کردۂ منزل کو جو منزل سے لگا دے
اے عظمتِ انساں وہ نظر ڈھونڈ رہا ہوں

جن موجوں سے اُٹھتے رہے طوفانِ حوادث
اُن موجوں میں ساحل کا اثر ڈھونڈ رہا ہوں

کہنے کو سحر کہہ دے اسے ساری خدائی
لیکن میں کوئی اور سحر ڈھونڈ رہا ہوں

اعجاز سے جس کے ہو تلاطم بھی کنارا
تسکیں میں وہی آج نظر ڈھونڈ رہا ہوں

منّت پذیرِ لذّتِ دردِ نہاں کے ہیں
تحفے ہمیں نصیبِ غمِ دوجہاں کے ہیں

پہچان اُس نگاہ کی رکھتا ہوں خوب میں
وابستہ جس سے تنکے مرے آشیاں کے ہیں

جس کو نہ آج تک کوئی آندھی بجھا سکی
ہم ایسے اِک چراغ ترے آستاں کے ہیں

ذرّے زمیں کے ہوں کہ فلک پہ ہو کہکشاں
جلوے کہاں کہاں نہیں اُس جانِ جاں کے ہیں

گھل گھل کے اب جگر بھی ہوا جا رہا ہے خوں
احسان ایسے ہم پہ کس مہرباں کے ہیں

جیسے ہیں چاک چاک یہ دامانِ آرزو
اَوراق ایسے اور بھی کس داستاں کے ہیں

وابستگی یہ کیسی مجھے آسماں سے ہے
جو رنگ دُودِ دل کے ہیں وہ آسماں کے ہیں

نازاں عبث ہے نظمِ چمن پہ تو باغباں
غنچے تو زرد زرد ترے گُلستاں کے ہیں

جو پھول خوشنما ہے وہ ہے باعثِ کشش
چرچے تو بے سبب نہیں میری زباں کے ہیں

تسکین کیا کریں گے وہ روزِ جزا کی فکر
سائے میں بادہ نوش جو رفعت نشاں کے ہیں

(۸۱)

تم اپنی شوخیٔ فطرت کو آشکار کرو
مگر نظر کو زیادہ نہ بے قرار کرو

شعورِ غم کو جو بخشے حیاتِ لافانی
خودی کو ایسی تجلّی سے ہمکنار کرو

عبث ہے رونا زمانے کی بے نیازی کا
جو کر سکو تو زمانے کو سازگار کرو

کرے جو تم پہ بقائے دوام کی بخشش
سکوں کو ایسے تلاطم سے ہمکنار کرو

چھلک نہ جائیں کہیں اشکِ غم کے پیمانے
اِن آنسوؤں کو غمِ دل کا رازدار کرو

نہ آئے گی وہ کبھی فصلِ گُل، جو آئی تھی
ہزار ویسی بہاروں کا انتظار کرو

قفس میں جشنِ بہاراں اگر نصیب نہیں
تو اِس کو خونِ تمنّا سے لالہ زار کرو

تمہارے جذبۂ دل کو بھی کیوں ہو محرومی
تُم اپنے حُسنِ عمل کا جو اعتبار کرو

سکونِ قلب میسّر نہ کیوں ہو اے تسکیںؔ
زباں سے ذکرِ صنم تم جو بار بار کرو

(۸۲)

بیچیں نہ وفا اپنی کسی دام پہ ہم تو
مر جائیں اسی بات، اسی نام پہ ہم تو

کیوں شکوۂ آلام رہے لب پہ ہمارے
مامور ازل سے ہیں اسی کام پہ ہم تو

اے شاہدِ فطرت، ترے جلووں کی قسم ہے
نظّارہ ترا کرتے ہیں ہر گام پہ ہم تو

رُلوا نہ سکے ہم کو یہ دُنیا کے حوادث
ہنستے ہی رہے گردشِ ایّام پہ ہم تو

وہ ہم نہیں محرومیٔ قسمت پہ جو روئیں
شاداں رہے ہر دم دلِ ناکام پہ ہم تو

دل اپنا رہے اُن کی طلب میں بھی تو صادق
روئیں نہ کبھی بھول کے انجام پہ ہم تو

امواجِ حوادث ہیں اور اپنا ہے سفینہ
گھبراتے نہیں شدّتِ آلام پہ ہم تو

پی لیں تری آنکھوں سے جو صہبائے محبّت
مائل نہ ہوں پھر اور کسی جام پہ ہم تو

اِس جادۂ الفت کی تو منزل نہیں تسکیں
کھاتے رہے ٹھوکر ہی ہر اِک گام پہ ہم تو

(۸۳)

مرے امکاں میں گُل کرنا نہیں اشکِ فروزاں کو
ترے دامن سے نسبت ہے فقط ایسے چراغاں کو

وہی حُسنِ حقیقی ہے، وہی ہے صورت و معنی
کرے جو زرد اپنی اِک جھلک سے ماہِ تاباں کو

جسارت مائلِ تقصیر ہونے کی ہمیں کب تھی
ترے زیرِ کرم عصیاں نہ سمجھا ہم نہ عصیاں کو

نہیں یہ کاوشِ غم رائگاں اپنی کسی عنواں
بنایا مشعلِ راہِ محبّت داغِ ہجراں کو!

اگر میں گھِر گیا طوفانِ غم میں، تو مجھے کیا غم
کہ روشن ہے نہیں کچھ استقامت غم کے طوفاں کو

بنایا آشیاں جس جا، وہیں اے برق تو پہنچی
نہ بھولے ہیں، نہ بھولیں گے کبھی ہم تیرے احساں کو

اماں اک دن وہی برقِ تپاں مانگے گی خود مجھ سے
نہ دے گی پھولنے پھلنے وہ کیتک نخلِ ارماں کو

چلی آتی ہیں جس رُخ پر ستم کی آندھیاں اب تک
اُسی رُخ پر ہمیں کرنا ہے روشن شمعِ ایماں کو

سحر کی ہو توقع کیا، سیاہی میں شبِ غم کی
دکھائیں گے وہ کب صورت کسی پامالِ حرماں کو

باندازِ قفس طرحِ نشیمن ڈال دی لیکن
ہوا ممکن نہ کرنا خوش گلستاں کے نگہباں کو

نہیں وہ موجِ مضطر میں جسے ساحل کی حسرت ہو
یہاں تو خود کنارا ڈھونڈتا ہے غرقِ طوفاں کو

ہوئی اپنی شبِ غم کی تلافی اس طرح تسکیںؔ
بنایا کیف زا منظر بہر نوع اشکِ لرزاں کو ★

کچھ میری وفا کی داد بھی ہے، میزانِ نظر پر تولو تو
اے شاہدِ بزمِ نازو ادا، خاموش ہو کیوں کچھ بولو تو

پرواز ہے کیوں محدود مری، یہ راز بھی تم پر روشن ہے
پرواز کی رفعت کیا ہوگی اے کاش مرے پَر کھولو تو

ہر شب میں سحر کا دھوکا ہو، پردہ جو ہٹاؤ رُخ سے تم
ہو جائے نمودِ شام ابھی، تم زلف کو دن میں کھولو تو

گھُل گھُل کے تپِ فرقت سے جگر بن جائے لہو تو بن جائے
اربابِ نظر تو دیکھیں گے، تم ایسے گہر بھی رولو تو!

اندازِ تکلّم بدلو تو، کیوں بات میں پیدا بات نہ ہو!
ہو زہر یہاں، جس ساغر میں اس جام میں امرت گھولو تو

شائد کہ مکمّل ہو جائے افسانۂ ہستی اے تسکیںؔ
صفحاتِ مقاصد میں پہلے اِک بابِ الم تم کھولو تو

کیا نیستی، جو ضامنِ نقشِ بقا نہ ہو
ہستی وہ کیا، جو راہ میں اُس کی فنا نہ ہو

وہ کون سی دُعا ہے جو ہوگی نہ مستجاب
لیکن دعا ہو دل سے، زباں سے دعا نہ ہو

سر اپنا دے کے شمع نے پائی ہے زندگی
اُلفت کا معجزہ ہے کہ مر کر فنا نہ ہو

دامن کے چاک شانِ کریمی کو دیں ہوا
لُطفِ جنوں تو جب ہے وہاں بھی سزا نہ ہو

جلوہ گری کچھ ایسی ہے اُس جانِ ناز کی
پیشِ نظر بھی آئے تو یہ چشم وا نہ ہو

اِک اِک نفس گواہ ہے وصلِ حبیب کا
پھر کیا عجب، بشر بھی خُدا سے مِلا نہ ہو

اَشکوں نے پھر لگائی ہے کچھ اس طرح جھڑی
بند اضطرابِ ہجر سے راہِ قضا نہ ہو!

تسکیں تمہیں جو کرنا ہے، کرلو وہ آج ہی
تُم سے تمہاری روح کہیں کل جُدا نہ ہو

(۸۶)

تذکرہ اُن کا لبوں پر بار بار آنے تو دو
ہاں! باایں صورت ذرا دل کو قرار آنے تو دو

وہ پئے ایفائے وعدہ آئیں گے اِک دن ضرور
جلوۂ رنگیں کا دل کو اعتبار آنے تو دو

غم سے گھبرانا ہے کیا، غم تو ہے جزوِ زندگی
اے خوشا! غم کا دلِ نازک پہ بار آنے تو دو

ہوش میں آجائیں گے سارے جہاں کے بادہ خوار
پھر فلک پر گیسوئے ابرِ بہار آنے تو دو

خود بخود ہو جائے گا اِک دن مداوائے الم
شاہراہِ زندگی میں خلفشار آنے تو دو

ابرِ گوہر بار سے برسیں گے قطرے خون کے
اِک ذرا گلشن میں مجھ کو اشکبار آنے تو دو

پھر یہ توبہ خود بخود بن جائے گی جام و سبو
میکدے پر جھوم کر ابرِ بہار آنے تو دو

مستیاں پھر پاؤں چومیں گی تمہارے مست کے
چشمِ گلشن میں ذرا رنگِ بہار آنے تو دو

پھر تو خود بیڑی پنہائے گا یہی دستِ خرد
عرصۂ دانش میں وحشت زرا بہار آنے تو دو

دیکھنا پھر بیٹھے بیٹھے تم چراغاں کی بہار
چار تارے ٹوٹ کر سوئے مزار آنے تو دو

جان ہیں دُنیائے الفت کی یہی بیتابیاں
کیا کہا تسکین! ذرا دل کو قرار آنے تو دو ★

نہ زخمِ نو کی ، نہ زخمِ کہن کی بات کرو
تمام عمر گُل و یاسمن کی بات کرو

سفینہ دل کا جو موجِ بلا میں آجائے
تو بحرِ غم کے کسی غوطہ زن کی بات کرو

نشاطِ صبحِ درخشاں نظر میں رقص کرے
جو بات بات پہ اُس سیم تن کی بات کرو

جو فصلِ گُل سے ہو بیزار تم گلستاں کی
تو کیفِ زخمِ دلِ خندہ زن کی بات کرو

گلے لگا لو خوشی سے غمِ زمانہ کو
مقامِ دار سے گزرو، کفن کی بات کرو

خزاں کا راج نہ ہوگا چمن پہ اور کبھی
روش روش پہ جو رنگیں کفن کی بات کرو

نہ آئیں راس فضائیں جو بحرِ ظلمت کی
تو ہر قدم پہ یمِ موجزن کی بات کرو

جس انجمن نے تمہیں غم عطا کئے تسکیں
بصد خلوص اُسی انجمن کی بات کرو

ذہنِ بوجھل کو کڑی دھوپ دکھاؤ یارو
آتشیں دور کے کچھ گیت سناؤ یارو

میری آواز سے آواز ملاؤ یارو
ورنہ سر اپنا کہیں جا کے چھپاؤ یارو

کم سے کم اتنا لہو بھی تو بہاؤ یارو
ایک تصویرِ حسیں جس سے بناؤ یارو

کچھ نظر آتا نہیں گھور اندھیرے کے سوا
صبح تک شمعِ تمنّا ہی جلاؤ یارو

جن میں چٹّان سے ٹکرانے کے ارماں ٹھہریں
ایسے جذبات کو سینے سے لگاؤ یارو

رہ گذرِ غم کی ہے دشوار تو دشوار سہی
محرمِ راز نہ غیروں کو بناؤ یارو

کچھ نہیں میرا تو اپنا ہی کرو آپ خیال
اِس طرح مجھ کو نہ ہر لمحہ رُلاؤ یارو

خاک کر دے نہ کہیں گردشِ دوراں تم کو
بیکسوں پر نہ ستم اتنے بھی ڈھاؤ یارو

قوم کی قوم ہے تسکیں ہی نہیں اس پہ سوار
ڈوبتی ناؤ کو اب بھی تو بچاؤ یارو

(۸۹)

جبیں کیوں نہ اپنی خدارا جھکا دو
خودی کا نہ کیوں داغ آخر مِٹا دو

وہی جلوۂ طُور مجھ کو دکھا دو
تجلّی کی دُنیا نظر میں بسا دو

تمنّائے رنگیں میں خود کو مٹا دو
رہِ عشق و اُلفت میں ہستی لُٹا دو

نقاب اپنے رُخ سے ذرا تم ہٹا دو
مرے بختِ خفتہ کو اب تُم جگا دو

ہوائیں خصومت کی چلتی ہوں جس جا
اُسی رہ پہ شمعِ محبّت جلا دو

۱۶۰

فغاں کیا، نہ حرفِ شکایت ہو لب پر
اُٹھے درد دل میں تو اُس کو دبا دو

تمہارے ستم کو خدا تم سے سمجھے
جلا دو مرا آشیانہ جلا دو

یہی اب مداوائے رنج و الم ہے
کرو نالہ، ارض و سما کو ہلا دو

نہ ذکرِ نشیمن، نہ یادِ چمن ہو
فریبِ محبّت میں آ کر بھلا دو

کہے جاؤ اشعار رنگیں تسکیںؔ
نئے پھول باغِ سخن میں کھلا دو

٩٠

افسردہ خاطری پہ مری کس نے کی نگاہ
دنیائے رنگ و بو سے عبث تھی مجھے بھی چاہ

بربادِ غم نہ ہو سکے برباد ہو کے ہم
کیا کر سکے گا کوئی غمِ دل کو بھی تباہ

رہنے لگا ہے وہ بھی مری طرح مضطرب
کس طرح کی ہے میں نے بھی پتھر کے دل میں راہ

نیت پہ جس کی آنچ ہو رحمت بھی جوش میں
دانستہ کر لیا ہے کبھی میں نے وہ گناہ

ماتم کناں ہیں ساحلِ دریا کی شورشیں
کشتی یہیں کہیں نہ ہوئی ہو مری تباہ

بارِ گراں یہاں تو ہے پھولوں کی بھی چبھن!
کس طرح لوگ کرتے ہیں کانٹوں سے بھی نباہ

تیرے مریضِ غم کا ہے احوال دیدنی!
آنکھوں میں اشک ہیں تو زباں پر ہے آہ آہ!

عالم شبِ فراق کا مجھ سے نہ پوچھیئے!
گذری جو مجھ پہ اس کی بس اک شمع ہے گواہ

اُس کے کرم کا پھر بھی ہے تسکین آسرا!
اعمال یوں تو اپنے ہیں سر چشمۂ گناہ

روتی ہیں میری حسرتیں عمرِ رواں کے ساتھ
کیا کام آ پڑا ہے مجھے آسماں کے ساتھ

یوں کر رہا ہوں رنج و الم سے نباہ میں
رشتہ ہو جیسے شمع کا سوزِ نہاں کے ساتھ

پہلے قرار تھا نہ تو اب ہے قرار کچھ!
دل کی خلش نہ کم ہوئی ضبطِ فغاں کے ساتھ

اپنی تو زندگی ہوئی کچھ اس طرح بسر
مجھ کو رہا نہ جیسے تعلق جہاں کے ساتھ

ایسے میں کیا کرے کوئی ساحل کی آرزو!
طوفاں قدم قدم پہ ہیں موجِ رواں کے ساتھ

دُنیائے دل ہے اپنی کہ ماتم کدہ ہے یہ !
میں وقفِ شامِ غم ہوں دلِ نوحہ خواں کے ساتھ

آتے ہیں کیوں مدد کو مری اشکہائے غم
کیا کام آنسوؤں کا ہے ضبطِ فغاں کے ساتھ

تسکینِ خستہ حال کا پوچھو نہ حال کچھ
کٹتے ہیں اس کے دن تو غمِ بیکراں کے ساتھ

۹۲

کیوں نہ طرحِ آشیاں ڈالیں چمن سے دُور کچھ
ہموطن سے دُور کچھ اور ہم سُخن سے دور کچھ

اپنی دنیا ساری دُنیا سے بسائی ہے الگ
لے گئے ہیں آشیاں اپنا چمن سے دور کچھ

تا بکے رہتا نشیمن بجلیوں کی زد میں اور
کر لیا اپنا ٹھکانا اِس چمن سے دور کچھ

بس سلام الوداع اے نغمہ سنجانِ چمن!
ہم تو جاتے ہیں بس اب صحنِ چمن سے دور کچھ

طرزِ مے نوشی الگ، آدابِ میخانہ جُدا
بزم ساقی کی ہے ہر رسمِ کہن سے دور کچھ

کیوں کلی دل کی نہیں کھلتی ہے آخر کیا ہوا؟
ہو گئے کیا ہم کسی غنچہ دہن سے دور کچھ؟

رنگ لائے گا جنوں آخر ہمارا بھی کبھی
پھر نہ ہوں گے ہم کہیں دار و رسن سے دور کچھ

قتل گاہِ عشق میں آئے تھے ہم تو سر بکف
حسرتیں لیکن رہیں تارِ کفن سے دور کچھ

کیا عجب، لائے اثر بھی ناوکِ دودِ جگر
جا رہا ہے آج یہ چرخِ کہن سے دور کچھ

ناقدانِ فن کو تسکیں، دعوتِ فکر و نظر!
دے رہی ہے یہ غزل شعر و سخن سے دور کچھ

۹۳

فطرت کے پُر اسرار نظاروں کی طرف دیکھ
اُس برقِ تجلّی کے شراروں کی طرف دیکھ

کہتی ہے خزاں، کھول کے عبرت کی نگاہیں
اِس گلشنِ فانی کی بہاروں کی طرف دیکھ

دم بھر میں کئے جاتے ہیں عالم تہہ و بالا!
اُس چشمِ فسوں گر کے اشاروں کی طرف دیکھ

فرقت میں ہیں اشکوں کے یہ قطرے بھی نظارے
اُلفت کے درخشندہ ستاروں کی طرف دیکھ

غمزے نہیں اُمّید و تمنّا کے ہیں، مامن!
بربادِ تمنّا کے سہاروں کی طرف دیکھ

پھیلائے کوئی خاک یہاں دامنِ امّید
گلہائے چمن کہتے ہیں خاروں کی طرف دیکھ

اب سانس بھی دشمن ہوئی بیتابئِ غم سے
اے چشمِ کرم درد کے ماروں کی طرف دیکھ

رہتا ہے خزاں میں بھی وہی رنگِ گلستاں
اس داغِ محبّت کی بہاروں کی طرف دیکھ

ہے جنبشِ مژگاں میں نہاں محشرِ ارماں
ظالم کے ستم کوش اشاروں کی طرف دیکھ

مجموعۂ اضداد ہے تسکینؔ یہ دُنیا
شبنم کی طرف دیکھ، شراروں کی طرف دیکھ

لکھتا ہوں خونِ دل سے الفت کا میں فسانہ
دیکھے زمانہ دیکھے یہ رنگِ والہانہ

رہتا ہے مجھ سے مخفی، قربِ رگِ گلو بھی
کھُل جائے کاش مجھ پر یہ رازِ مشفقانہ

اُن کی نظر کا مارا اُٹھتے نہ میں نے دیکھا!
دیکھے ہیں یوں تو میں نے اندازِ ساحرانہ

دامانِ یار تک میں پہنچوں جو گرد بن کر
شاید پسند آئے اندازِ عاجزانہ!

کل تک جو ہنس رہے تھے گلہائے باغِ عشرت
ہیں اشک ریز اب وہ کیا آگیا زمانہ

ملتا ہے درس جس سے کلیوں کو بھی فنا کا
لکھا ہے برگِ گل پر شبنم نے وہ فسانہ

بیتابیٔ جگر ہی الفت کی جاں ہے تسکیں
مشکل میں مسکرانا سیکھے ابھی زمانہ ★

(۹۵)

آج اپنے بھی نظر آتے ہیں بیگانے سے
رنج کیوں کیجئے دنیا کے بدل جانے سے

اجنبی لگتے ہیں ہم اس کو، یہ دنیا ہمکو
کیا تعلق رہے کہ دونوں لگے ہیں بیگانے سے

موت آتی نہیں آجاتی تو اچھا ہوتا!
اب غمِ زیست بہلتا نہیں بہلانے سے

خواہشِ باغِ ارم ہو نہ کبھی جس کے عوض
دل گیا ایسا صنم، مجھ کو صنم خانے سے

قصۂ دل میں ہے ارمانوں کے خوں کی سرخی
آشنا کیوں ہو زمانہ مرے افسانے سے

شیشۂ دل کی نزاکت کو نہ سمجھا تُو نے
بال پڑ ہی گیا ظالم ترے ٹھکرانے سے

رازدارِ غمِ اُلفت مرے آنسو ٹھہرے
رہ گئے دُور ہی دامن پہ ٹپک جانے سے

مان لیں شرطیں بھی سب میں نے اسیری کی مگر
باز آیا نہ وہ ظالم مجھے تڑپانے سے

ٹل گئیں ساری بلائیں مرے سر سے تسکیںؔ
غم ہوا میرا غلط، پی کے بہک جانے سے

یہ میری زندگی کیا زندگی ہے
ازل سے جو مصیبت ہے وہی ہے

بتا کیوں مجھ سے آخر برہمی ہے
مجھے منظور تیری ہر خوشی ہے

فضائے دہر میں کیوں خامشی ہے
یقیناً سازِ الفت کی کمی ہے

جو ہم رونا بھی چاہیں تو ہے مشکل
یہ کیسی بے بسی سی بے بسی ہے

یہی داغِ محبت تو ہے سب کچھ
اسی کی تو زمانے میں کمی ہے

چمن میں یوں تو گُل کتنے ہیں خنداں
تمہاری اور ہی لیکن ہنسی ہے

ہوا ہے غم کدہ جس سے منوّر
تصوّر کی ترے وہ چاندنی ہے

نہیں تفریق اب شام و سحر کی
ہماری بے خودی کیا بے خودی ہے
ہوئی ہیں جس سے خیرہ میری آنکھیں
تبسّم کی ترے وہ روشنی ہے
نظر آئے نہ کیوں موجوں میں ساحل
کرم کا اُس کے حاصل روشنی ہے
ہوا جاتا ہے اُس کا قُرب حاصل
عجب رنگین اپنی مے کشی ہے
تجھے کس بات کی ہے فکر تسکیںؔ!
ترے ہر شعر میں اِک زندگی ہے

(۹۷)

بڑی بے بسی میں ہے اب زندگانی
جَھلکتی ہے آنکھوں سے دل کی کہانی

ملا مجھ کو کب ساغرِ کیف آگیں
کٹی میکدے میں بھی کیا زندگانی

وہ نجمِ سحر ہو کہ خورشید و کوکب
ترے سامنے سب ہوئے پانی پانی

خموشی میں حرفِ تکلّم چھُپا ہے
کبھی رنگ لائے گی یہ بے زبانی

محبّت نے مجھ کو کہیں کا نہ رکھّا
بڑی پھیکی پھیکی رہی زندگانی

ہر اک خارِ گلشن کا ہے گُل بداماں
خزاں آشنا پھر بھی اُن کی کہانی

تصوّر میں تصویر اُن کی جو کھینچی
ہوئے صدقے سو جاں سے بہزاد و مانی

بھروسہ کریں ہم بھی تسکین کس پر
یہاں کا ہر اک نقش ہے نقشِ فانی

تصور ترا کیا سے کیا بن گیا ہے
جنوں خود بخود دَرہ نُما بن گیا ہے

کچھ اِس طرح دل کو ہے اُس سے تعلّق
وہ بُت جیسے میرا خدا بن گیا ہے

ترا عکسِ تاباں ہے یا دل ہمارا
یہ دل بھی عجب آئینہ بن گیا ہے

خوشی میں بھی آنکھوں سے ہیں اشک جاری
یہ دل کیسا غم آشنا بن گیا ہے

سرِ دار آجاؤ تم حق کی خاطر
یہ اقدام اُن کی رضا بن گیا ہے

ہوا جس کے باعث میں پامالِ حسرت
وہی حادثہ مدّعا بن گیا ہے

جو دردِ جگر لا دوا بن چکا تھا
وہی آپ اپنی دوا بن گیا ہے

قیادت میں اُس کی چلا جا رہا ہوں
مرا جذبِ دل رہنما بن گیا ہے

خزاں بھی ہے رونق نما آج تسکیںؔ
چمن کا چمن آگ سا بن گیا ہے

(۹۹)

جو رنگِ دل اِدھر ہے، وہ شاید اُدھر بھی ہے!
اِس آہِ بے اثر میں بلا کا اثر بھی ہے!

پامالِ شامِ غم کو کب اِس کی خبر بھی ہے!
گھونگھٹ میں شامِ غم کے عروسِ سحر بھی ہے!

کچھ وجہِ دلکشی نہیں رنگینیٔ بہار
اِس کا تو انحصار ترے حُسن پر بھی ہے

کیا پا سکے گی تجھ کو مری وسعتِ نگاہ!
وسعت کے ساتھ ساتھ ہی حدِّ نظر بھی ہے

جس رہگذر سے ملتا ہے منزل کا ہر نشاں
ملحق اُسی سے ایک تری رہ گذر بھی ہے

کیا کیا خیال لے کے ہیں دامانِ چشم میں!
گذرا کہاں کہاں سے اُنہیں کچھ خبر بھی ہے؟

روشن ہے بے ثباتیٔ ہستی کی یہ دلیل
ہر کارواں حیات کا گرمِ سفر بھی ہے

رہ رہ کے یہ سوال کیوں آتا ہے ذہن میں
میخانۂ حیات میں اپنا گذر بھی ہے؟

جلوہ گری کا اُس کی ہیں قائل ہی کب ہوا
شُہرہ تو جا بجا ہے، کہیں جلوہ گر بھی ہے؟

یوں ضامنِ سکوں ہوئی تسکین اُن کی یاد
پہلو میں جیسے اپنے کوئی چارہ گر بھی ہے!

(۱۰۰)

قدم قدم پہ وہ کیا کیا ستم نہیں کرتے
خلاف اِس کے گلہ اُن کا ہم نہیں کرتے

اُنہیں سے کیوں دلِ محزوں کو ربط ہے یا رب
ستم پہ جن کی نظر ہے، کرم نہیں کرتے

وہ ڈھا رہے ہیں دلِ ناتواں پہ لاکھ ستم
مگر یہ ظرف ہے اپنا کہ غم نہیں کرتے

تباہ کر کے ہے پُرسِش تباہ حالی کی
بایں خلوص بھی وہ ظلم کم نہیں کرتے

جنوں کا ہاتھ تھا اس میں ضرور اے ہمدم!
وگرنہ ہوش میں دامن کو نم نہیں کرتے

یہ تیرا در ہے ازل سے جہاں ہیں سر بسجود
ہم اپنے سر کو کہیں اور خم نہیں کرتے

جو حسرتوں کا نہ ہو جا نا خون اے تسکیں
بہ شکلِ آہ بھی اظہارِ غم نہیں کرتے!

(۱۰۱)

آہ جب مجھ ناتواں کی عرش سے ٹکرائے ہے
دامنِ رحمت نہ کیوں پھر ہاتھ میرے آئے ہے

جذبۂ دل کی کشش ہے، وہ جو کھنچتا آئے ہے
ورنہ کب اپنا سفینہ یوں کنارا پائے ہے

کیا خبر کس غم کا ہے یہ پیش خیمہ اضطراب
دل مرا رہ رہ کے یا رب آج کیوں گھبرائے ہے

کاش ہو جائے حقیقت فصلِ گُل کی منکشف
دل مرا پیہم فریبِ فصلِ گُل کیوں کھائے ہے

کِس نے لی دادِ وفا، نامِ وفا پر دہر میں!
ہائے! ہائے! کیوں کوئی راہِ وفا میں جائے ہے

گلشنِ عالم میں آکر ہو گا کوئی شادماں!
راس کب اِس کی فضا بھی میرے دل کو آئے ہے

کیا بچے نظروں میں اپنی یہ بہارِ گلستاں!
داغہائے دل سے جبکہ فصلِ گُل شرمائے ہے

کس کے جلووں نے مجھے بخشی ہے ایسی بیخودی
عالمِ حیرت میں ہوں یا ہوش اُڑتا جائے ہے

کیف ساماں خود ہی تسکینِ اضطرابِ دل ہو اب
میں ہوں شیدائی اُسی کا جو مجھے تڑپائے ہے

لحد میں آئے ہیں دُنیا سے مُسکرائے ہوئے
بہارِ زیست کو جیسے ہوں ساتھ لائے ہوئے

فریبِ زیست ہی کیا کم ہے اے دلِ ناداں
نہ دے فریب کہ ہم ہیں فریب کھائے ہوئے

کسی کو ایسی سعادت بھی تو نے کب بخشی!
جو تیرے غم کو گلے سے ہوں ہیں لگائے ہوئے!

کہاں ہے شمعِ محبّت کا کوئی پروانہ!
چراغ دیر سے بیٹھے ہیں ہم جلائے ہوئے

ہری ہوئی نہ مری شاخِ آرزو اب تک!
یہ نخلِ شوق تو مدّت ہوئی لگائے ہوئے

ہماری طرح نہ کوئی فریبِ غم کھائے!
خوشی کی آس میں بیٹھے ہیں غم بُھلائے ہوئے

مری طرح نہ ہو دنیا میں مضطرب کوئی
زمانہ ہو گیا دل کو قرار آئے ہوئے

وفا کا نام زمانے میں مجھ سے روشن ہے
مری وفا کو زمانہ ہے آزمائے ہوئے

خوشا نصیب، یہ ہے ضبطِ غم، ترا احساں!
کہ موتیوں کو ہیں آنکھوں میں ہم چھپائے ہوئے

رہینِ ساغر و صہبا نہیں ہیں ہم لیکن
جہانِ دل کو ہیں رنگیں مگر بنائے ہوئے

★

یہ کس نے کر دیا پابندِ اضطرار مجھے
یہ کس کی یاد ستاتی ہے بار بار مجھے

ملا بھی کوئی تو وہ دشمنِ قرار ملا
ملا نہ کوئی زمانے میں غمگسار مجھے

مقامِ ہوش و خرد سے جو کردے بیگانہ!
ہے اُس بہار کا مدّت سے انتظار مجھے

نظر سے پیدا کروں کیوں نہ آج وہ گوہر
کریں جو رشتۂ اُلفت سے ہمکنار مجھے

اُٹھاؤں رونقِ گلشن کی سمت کیوں آنکھیں
عزیز تر ہے کہیں اُس سے لُٹے یار مجھے

تمام عمر دلِ مضطرب سے کام رہا!
عزیز کیوں نہ ہو یہ وجہِ انتشار مجھے

خزاں کا دور بنامِ بہار آیا ہے
کسی نے خاک دیا مژدۂ بہار مجھے

خزاں کا رنگ مسلّط ہے یوں گلستاں پر
ملے گا جیسے نہ اب مژدۂ بہار مجھے

ملیں تو کتنی ہی راہیں ترے تجسّس میں
مگر نہ مل سکی اِک تیری رہگذار مجھے

نظر فریب نظارہ ہے اُن کے جلووں کا
کب ایسی جلوہ گری پر ہو اعتبار مجھے

نہ چھوڑا وحشتِ دل نے جہاں جہاں میں گیا
کہیں کا رکھّا نہ تُو نے تو اَے بہار مجھے

خبر بھی بحرِ تمنّا میں اس کی کیا تسکین
ملے گی زیست بھی طوفاں سے ہمکنار مجھے

★

نظر کو کب سے تیری جُستجو ہے
یہی لے دے کے اپنی آرزو ہے

رہے گا تا بکے وہ مجھ سے چھُپ کر
مرا ذوقِ نظر آئینہ جُو ہے

نہیں ممکن بھُلا دینا بھی اُن کو
کہ روشن اُن سے شمعِ آرزو ہے

نہالِ آرزو سینچا ہے خوں سے
رگِ دل میں کہاں باقی لہو ہے

جفا پرور اُدھر ہے اُن کی فطرت
وفاؤں پر اِدھر مِٹنے کی خُو ہے

تپِ غم سے پُھنکا جاتا ہوں لیکن
زباں پر اُف نہیں، یہ میری خُو ہے

تری خاطر کٹا دے سر جو اپنا
وہی راہِ وفا میں سُرخرو ہے

اثر ہوگا نہ کچھ طوفانِ غم کا
تلاطم آشنا یہ آرزو ہے

ڈبو دے اے محیطِ بحرِ اُلفت
نہیں ساحل کی مجھ کو آرزو ہے

نہیں ملنے کی اُن سے شکل کوئی
عجب مشکل میں تسکینِ آرزو ہے

ہمیں پہ ٹھانی ہے کیوں بجلیاں گرانے کی!
کڑی ہمیں سے ہے قائم ترے فسانے کی!

اُدھر ہے کوششِ پیہم ہمیں ستانے کی!
اِدھر خوشی ہے غمِ دل کے ہاتھ آنے کی!

اُدھر ہے فکر اُنہیں گُل کوئی کِھلانے کی
اِدھر تو جہدِ مُسلسل ہے داغ کھانے کی

ہمارے شیشۂ دل کی جِلا تو باقی ہے
فضا بلا سے مکدّر ہوئی زمانے کی!

وہ اور ہوں گے جنہیں بجلیوں کا ڈر ہو گا
ہمیں تو سُوجھی ہے بجلی میں گھر بنانے کی

یہ عندلیبِ گلستاں ہوں تجھ سے کیوں نالاں
نکالے شکل کوئی تو اگر نبھانے کی!

نظریں گھوم گئی ہیں وہیں تری آنکھیں
کہیں چلی ہیں جو باتیں شراب خانے کی

سکون ہوگا میسّر کسی کو اے تسکینؔ
ہمیں تو راس نہ آئی ہوا زمانے کی!

★

(۱۰۶)

جب سے رشتہ ہم نے جوڑا گردشِ ایّام سے
اُنسیّت سی ہو گئی رنج و غم و آلام سے!

جب بھی میں گھبرا گیا ہوں شدّتِ آلام سے
کی ہے میں نے گفتگو پہروں دلِ ناکام سے

نُور و ظلمت کی نہیں ہوتی مجھے تخصیص کچھ
میرا دل مانوس اتنا ہے سوادِ شام سے

اس کے آتے ہی سجا لیتے ہیں بزمِ یادِ یار
ہم کو اُلفت ہو گئی ہے اب سوادِ شام سے

ساقیا! محتاط رہ، تو دل شکن ایسا نہ بن
ہِل نہ جائے طرحِ میخانہ شکستِ جام سے

میری نظروں میں رہے تفریقِ صبح و شام کیا!
دل جلوں کو واسطہ ہی کیا ہے صبح و شام سے

اپنی رعنائی پہ نازاں گُل نہ ہوتے عمر بھر
آشنا ہوتے اگر وہ بھی کبھی انجام سے

تیری نظروں کے عطا کردہ جو پیمانے ملیں
ہو کبھی مجھ کو نہ رغبت میکدے کے جام سے

شامِ فرقت میں دیئے جلتے ہیں اُن کی یاد کے
روشنی کچھ اور بڑھتی ہے نمودِ شام سے

تُو سمجھتا ہے کہ دن اچھے بھی آئیں گے ترے
باز آ جا اب بھی تسکینؔ اِس خیالِ خام سے

تری رفعتوں کی حدود تک کبھی فکر اپنی رسا بھی ہے؟
مرا کاروانِ خیال کیوں تری جستجو میں چلا بھی ہے؟
رہا کفر ہی کا وہ ہمنوا، کبھی معتقد نہ ہوا ترا!
تری راہ سے جو بھٹک گیا، اُسے کیا خبر کہ خدا بھی ہے!
ترے حُسنِ تیرِ نظر کو ہم نہ بُھلا سکے، نہ بُھلائیں گے
وہی دردِ دل کا سبب بھی ہے، وہی دردِ دل کی دوا بھی ہے
یہی معجزہ تو ہے عشق کا، یہی اصل میں تو ہے زندگی!
ترے عشق میں جو جلے بجھے، اُسے کیا خبر کہ فنا بھی ہے!
سرِ رہگذر ہی وہ لُٹ گیا، نہ پہنچ سکا وہ مراد کو!
تری رہگذر میں بھی آ کے کب کوئی بال بال بچا بھی ہے؟
رہِ ہست و بُود میں ہمسفر مرا اک نہ اک تو ہے بالیقیں
کہیں ہمسفر جو حیات ہے، تو قدم قدم پہ قضا بھی ہے
مجھے ہے یہی تو عزیز تر، کسی شئے پہ اب ہے کہاں نظر
تری یاد سے دلِ پُر الم کسی لمحہ میرا جُدا بھی ہے؟ ★

(١٠٨)

ہزار مجھ پہ ستم، وہ ستم شعار کرے
مگر یہ دل مرا اُف بھی نہ ایک بار کرے

تمہارے غم کو جو سینے سے ہمکنار کرے
تو پھر خزاں میں وہ پیدا نئی بہار کرے

سمودیں کیوں نہ بھلا خود کو اُن کے جلووں میں
یہ کون زحمتِ نظّارہ بار بار کرے

ابھی کہاں غمِ دوراں سے مل سکی فرصت
کسی سے کہہ دو کہ کچھ اور انتظار کرے!

خمار کہیئے اسے کیوں بنا دے جو بیخود
خمار وہ ہے جو میکش کو ہوشیار کرے

لبوں پہ اُس کے تصدّق مری بقا و فنا
جو تیرا ذکر محبّت سے ایک بار کرے

درِ حبیب سے کیا کچھ نہیں ملے تسکین
رہِ حبیب تو دل تیرا اختیار کرے

کہنے کو تری ذات تو بے نام و نشاں ہے
لیکن ترا جلوہ تو ہر اک شئے سے عیاں ہے

اشکِ سرِ مژگاں نہیں بے مصلحت ہرگز
ہر اشک کے قطرے میں نہاں دل کی زباں ہے

ہر رنگِ مجازی میں ہے اِک رنگِ حقیقی
جانے گا کوئی کیا جو مجھے عشقِ بتاں ہے!

کرتا رہا تعمیرِ نشیمن یہ سمجھ کر
پردے ہی میں تعمیر کے تخریب نہاں ہے

پژمردہ اگر گُل ہیں تو ہر غنچہ فسردہ
یہ موسمِ گُل ہے کہ بہاروں پہ خزاں ہے!

تا چند رہے پیشِ نظر نقشِ خیالی
لے چل مجھے اے دل وہیں وہ یار جہاں ہے

کیا کہئے قدم اپنا ہے کس راہ میں تسکیںؔ
★ اب گریۂ شبنم بھی مرے دل پہ گراں ہے

(۱۱۰)

خزاں نُما سہی، رنگینیٔ بہار تو ہے
فضا بقدرِ نظر آج خوشگوار تو ہے

بچائیں کیوں نہ تباہی سے اپنے گلشن کو
کہ اس چمن پہ ہمارا ہی اختیار تو ہے

لہو شہیدوں کا یوں رائگاں نہیں ہوتا
برنگِ سرخیِ گُل رونقِ بہار تو ہے!

سکون کُنجِ قفس میں کسے نصیب ہوا؟
یہ کیا ہے کم کہ قفس میں ہمیں قرار تو ہے!

ستم ظریفیٔ افلاک کا نہ کر شکوہ
برنگِ ابر جہاں میں یہ اشکبار تو ہے!

دکھائیں یا نہ دکھائیں وہ جلوۂ رنگیں
مگر یہ آنکھ مری فرشِ رہگزار تو ہے

یہ اور بات ہے، دیکھے نہ اس کو چشمِ بشر
وجود برقِ تجلّی کا آشکار تو ہے

یہی ہے باعثِ تسکیں لحد میں اے تسکیںؔ
کسی کی شمعِ محبّت سرِ مزار تو ہے!

★

کیوں دردِ لا دوا کا مداوا کرے کوئی
کیوں سعیِ چارہ ساز کو رُسوا کرے کوئی

چاہے تو، ہر جگہ اُسے دیکھا کرے کوئی
لیکن نظر بھی ایسی تو پیدا کرے کوئی

کیوں ضبطِ اشکِ غم کو بھی رُسوا کرے کوئی
تڑپے اگر ہے کوئی تو تڑپا کرے کوئی

حُسنِ ازل کے تُم ہی تو عکسِ جمیل ہو
کیوں تم کو بار بار نہ دیکھا کرے کوئی

اب تو سکون و صبر کا ساغر چھلک چلا
تا چند موجِ غم سے بھی کھیلا کرے کوئی

وحشت نواز دل کا تو ملتا نہیں پتہ!
صحرا سے تارِ زلف میں ڈھونڈا کرے کوئی

کیوں تار تار دامنِ دنیائے ہوش ہو!
اور رازِ بیخودی کو بھی افشا کرے کوئی

پنہاں نظر سے رہ کے بھی پنہاں نہ رہ سکا
پردہ اگر یہی ہے تو پردا کرے کوئی

اُن کی رضا کا ایک بھی سجدہ نہ ہو سکا!
کیا ہوگا! عمر بھر بھی جو سجدا کرے کوئی

دو چار اضطراب سے تسکین ہم تو ہیں
پھر بھی نہیں وہ حال کہ رُسوا کرے کوئی!

کب شمعِ محبّت بجھے طوفانِ بلا سے
نسبت ہے اسے جبکہ ترے رُخ کی ضیا سے

رہبر کو گئے دیر ہوئی دارِ فنا سے
منزل کا نشاں پوچھئے نقشِ کفِ پا سے

بچتے نہیں اس راہ میں دیکھا ہے کسی کو
کیا راہِ محبّت ہے ملی راہِ قضا سے؟

رہتا ہوں مصائب کے تلاطم میں بھی شاکر
ہوتا نہیں پسپا میں کبھی موجِ بلا سے

رکھ دی ہے بہ اندازِ قفس طرحِ نشیمن
کچھ دُور چلا آیا ہوں گلشن کی ہوا سے

کرتا رہا ہیں فکرِ نشیمن ہی برابر
دامن مرا چھوٹا نہ کبھی برقِ بلا سے

کرتا نہیں اکثر میں دعا اب یہ سمجھ کر
شاید ہے اثر دور بہت میری دعا سے

جھک جائے جبیں حسنِ عقیدت میں کہیں بھی
ہو دیر یا کعبہ، ہے غرض تیری رضا سے

مٹ جاتے ہیں پروانے تو خود شمع پہ تسکیںؔ
ملتا ہے ہمیں درسِ وفا، اہلِ وفا سے

شخصیّت یوں قُدسیوں کی ہے بشر کے سامنے
جیسے رنگِ شام ہو رنگِ سحر کے سامنے

چاہتی ہے داد اپنی انتہائے بے بسی
ہے نشیمن خاک ہونے کو نظر کے سامنے

دھمکیاں دار و رسن کی اے زمانہ ہیں عبث
ہیں یہ معراجِ نظر آشفتہ سر کے سامنے

دیدنی ہیں اُن کی فرقت میں یہ قطرے اشک کے
سب مناظر ہیچ ہیں اِس چشمِ تر کے سامنے

لعل و گوہر کا ہے مخزن یہ ہماری چشمِ تر
ابرِ گوہر بار کیا ہے چشمِ تر کے سامنے

پھر اُسے ہوگی خبر بھی جیب و داماں کی کہاں
فصلِ گُل آنے تو دو شوریدہ سر کے سامنے

کشتیٔ اُمّید ساحل سے لگے گی بالیقیں
کیا ہے طوفانِ بلا، عزمِ بشر کے سامنے

اُن کو دعوٰی ہے سخن سنجی کا اے تسکین جب
کیوں نہیں آتے ہیں وہ اہلِ نظر کے سامنے

(۱۱۴)

پھر بس گئے نظر میں گلستاں نئے نئے
پھر کھائیے فریبِ بہاراں نئے نئے

کیا ہوگا حشر ان کا بھی معلوم ہے ہمیں
اُبھرے ہیں اپنے دل میں جو ارماں نئے نئے

نکلی نہ کوئی شکل بہلنے کی اے ندیم!
دیکھے بدل بدل کے بھی عنواں نئے نئے

اب تک ہیں اپنے ذہن پہ جیسے وہ مرتسم
موجوں نے جو اُٹھائے ہیں طوفاں نئے نئے

کیا ذکرِ موجِ بحرِ حوادث سے فائدہ
تا عمر ہم نے دیکھے ہیں طوفاں نئے نئے

٢٠٥

وحشت نواز آئے گی فصلِ بہار پھر
پھر ہوں گے چاک چاک گریباں نئے نئے

اس دَورِ نَو میں دیکھئے اِنساں کی زندگی
خود کر رہی ہے موت کے ساماں نئے نئے

تسکینِ سکونِ دل کے تجسّس میں بارہا
ہم پا گئے ہیں دَرد کے عنواں نئے نئے

مجھ کو ہوتا ہے یہ گماں جیسے!
مجھ پہ ٹوٹا ہو آسماں جیسے!

لب پہ مُہرِ سکوت ہے اپنے
دہر میں ہم ہیں بے زباں جیسے!

ایسی بدلی ہے گردشِ دوراں
گُم ہو منزل سے کارواں جیسے

میری آنکھوں نے بارہا دیکھا!
جلوہ اُن کا یہاں وہاں جیسے!

کیا کرشمہ بھی ہے تصوّر کا!
خود وہ آئے کشاں کشاں جیسے

مُسکراہٹ کا اُن کی وہ عالم!
بھر دے آنکھوں میں بجلیاں جیسے

اُن کی زلفوں میں زرفشاں افشاں
کالی راتوں میں کہکشاں جیسے

درد پہلو میں یوں دبائے ہوں
بھول بیٹھا ہوں میں فغاں جیسے
پُرزے پُرزے ہیں یوں تمنّا کے
نامکمّل ہو داستاں جیسے
شاد ہیں اِس طرح قفس میں ہم
راس آئے نہ گلستاں جیسے
رنگ دیکھے ہیں یوں بہاروں کے
یاد آئے ہمیں خزاں جیسے
جی رہا ہوں میں اِس طرح تسکینؔ
زندگی مجھ پہ ہو گراں جیسے

۱۱۶

کاش اُن کو بھی پیار ہو جائے
زندگی نغمہ بار ہو جائے

اُن کا آنا جو میرے گھر میں ہو
غم کدہ پُر بہار ہو جائے

کیا بھروسہ جو رُک گئے آنسو
راز کب آشکار ہو جائے

وعدہ کچھ اِس طرح کرو پھر تُم
دل کو پھر اعتبار ہو جائے

رُخ سے اُن کے ذرا ہٹے گیسو
پھر تو صبحِ بہار ہو جائے

وہ نہ آئیں تو موت ہی آئے
ختم تو انتظار ہو جائے

غم کو گر جزوِ زندگی سمجھو
زندگی خوشگوار ہو جائے

یہ غزل بھی تمہاری اے تسکینؔ
کیا عجب، شاہکار ہو جائے

★

(۱۱۷)

کسی کی زندگی، بن کر پیام نو بہار آئی
اِک اپنی زندگی، تصویرِ غم سے ہمکنار آئی

گذرتی ہے جو ہم پر، کس سے کہیئے اور کیا کہیئے
بقا اپنی، ازل سے دشمنِ صبر و قرار آئی

تو ہی اے شمعِ محفل اِک نہیں بربادِ سوزِ غم
شبِ غم میں ہماری زندگی بھی اختصار آئی

کچھ ایسا تو نے او ظالم مرے دل میں کیا ہے گھر
بھلانے پر بھی تیری یاد مجھ کو بار بار آئی

رَمق کلیوں کے منہ پر ہے، نہ گُل میں ہے وہ رعنائی
چمن میں اب کے تو کچھ اِس طرح فصلِ بہار آئی

نشاں پایا نہ اور رفعت نشاں تیرا کہیں اس نے
تجھے یہ روحِ مضطر دیر و کعبہ تک پکار آئی

تجسس میں ترے دیر و حرم تو ایک کر ڈالے
نظر پھر بھی نہ تیری ذات مجھ کو جلوہ بار آئی

رہے تا عمر محروم تمنا، ہم تو اے تسکین
فضائے دہر میں کیا زندگی بھی سوگوار آئی

★

اپنوں سے کر کے ہیں نے کنارا کبھی کبھی
جینے کا پا لیا ہے سہارا کبھی کبھی

ساحل کی آرزو ہے تو موجوں سے کیوں ہراس
ہوتی ہے موجِ غم بھی کنارا کبھی کبھی

باقی جو دن ہیں وہ بھی مصائب کے کاٹ لیں
حاصل ہو کاش اُن کا سہارا کبھی کبھی

کیا غم، جو جامِ غم کو لگائے ہیں لب سے ہم
ہوتی ہیں تلخیاں بھی گوارا کبھی کبھی

صد حیف! کی نہ ہم نے توجہ اُدھر ذرا
گو فرض نے، ہمیں ہے پکارا کبھی کبھی

اَشکوں سے کام ہے، کبھی آہوں سے واسطہ
ہوتا ہے یوں بھی اپنا گذارا کبھی کبھی

ممکن نہیں جو دیکھوں میں گُلشن کی سمت بھی
ہو جائے کاش اُن کا نظارا کبھی کبھی

غیروں سے تو ہوا ہے، کچھ اپنوں سے کیا ہوا
مجبوریاں ہوئی ہیں سہارا کبھی کبھی

تسکینِ اضطراب کی نیرنگیاں، نہ پُوچھ
پہلو میں دل بھی ہوتا ہے پارا کبھی کبھی

نگاہِ ناز کا کچھ اس طرح ناوک بھی چلتا ہے
کہ اُس کی سمت خود ہی صید جانے کو مچلتا ہے

غلط، کہ شمع جلتی ہے، تو پروانے بھی آتے ہیں
مرے دل میں چراغِ آرزو تو کب سے جلتا ہے

چمن ہو یا کہ صحرا جائیے لے کر جہاں اِس کو
دلِ وحشی کہیں اے دوست بہلائے بہلتا ہے؟

ہوا ہے قطرۂ نیساں مری آنکھوں کو کیا حاصل؟
دُرِ شہوار دامن پر جو آنے کو مچلتا ہے

کوئی محرومِ ساغر اور کوئی مستِ مئے رنگیں!
تری محفل میں ساقی کیسا دورِ جام چلتا ہے

کرشمہ ہے یہ قدرت کا، کسی کو دخل کیا اِس میں
کوئی کانٹوں سے وابستہ، کوئی پھولوں میں پلتا ہے

اُدھر بادہ بکف نظریں، اِدھر تشنہ نظر اپنی
کسی کو کیا خبر، ساغر سے ساغر میں جو ڈھلتا ہے!

دلِ مضطر کا عالم آج اے تسکین کیا کہیے
نہ اِس پہلو سنبھلتا ہے نہ اُس پہلو سنبھلتا ہے

★

۱۲۰

اور عشاق بھی کب مورد الزام رہے
اک ہمیں ہیں جو ترے عشق میں بدنام رہے

کیوں نہ تڑپاؤں زمانے کو تڑپ کر میں بھی
تا بکے دل بھی مرا مرکزِ آلام رہے

کیا خبر تھی کہ ہمیں ہوں گے گرفتارِ الم!
اور بھی ہیں جو سدا بندۂ اصنام رہے!

سنگ پارے کی طرح راہِ بقا میں ہم تو
ٹھوکریں کھاتے ہی تا عمر بہر گام رہے

تشنہ کامی کا گلہ پھر نہ رہے رندوں کو
ساقیا! فیض جو اِس طرح ترا عام رہے

پھر تو گردش سے نگاہوں کی چلے جام پہ جام
چشمِ ساقی جو لیے بادۂ گلفام رہے

جس نے جھیلی نہ ہوں کڑیاں ہی مصائب کی کبھی
درد والوں سے بھلا پھر اُسے کیا کام رہے

ہم مسافر ہیں رہِ ہستی و عدم کے تنہا
ہم ہی لے دے کے بہر رنگ بہر گام رہے

رشتۂ ہستی و عدم کے ہیں ہمیں دونوں سرے
کل بہ آغاز تھے ہم، آج بہ انجام رہے

ان کی فرقت میں کہاں اس کی خبر بھی تسکینؔ
صبح ہو جائے کہ تا حشر یہی شام رہے

تری نگہ کا ہوں میں صید، کیا یہی کم ہے!

خوشا اسیر وہ، حاصل جسے ترا غم ہے!

یہ مانا اپنا سفینہ ہے دور ساحل سے

سہارا اُن کی نگاہوں کا پھر بھی کیا کم ہے

غرض چمن سے ہو کیا اُن قفس نصیبوں کو

لکھا ہی جن کے مقدّر میں عمر بھر غم ہے

یہ امرِ حق ہے کہ حاصل نہیں خوشی مجھ کو

اگر ہے جانِ مسرّت، تو بس یہی غم ہے

محیطِ موجِ بلا ہوں بلا سے طوفاں میں

کنارا ڈھونڈ ہی لوں گا، مجھے نہیں غم ہے

نظر میں رقص کُناں ہے جہانِ رنگیں کیوں

ہمارے سامنے شاید وہ ساغرِ جم ہے

★ جو روئیں ہم تو زمانہ ہی رو پڑے تسکیںؔ

کہ اب تو رونے کا اپنے عجیب عالم ہے

(۱۲۲)

طُور کی طرح دل میرا جلتا رہے
نُور آنکھوں سے میری اُبلتا رہے

موجِ غم سے پہلے جا بیئے کھیلتے
دل مچلتا رہے تو مچلتا رہے

پیچ و خمِ زلف کے تم دکھاتے رہو
یہ جنوں میرا شاید بہلتا رہے

آئیں وہ یا نہ آئیں مگر رات دن
اِک تصوّر کا فانوس جلتا رہے

پھر مژہ پر جو اپنی ہو اشکِ الم
پھر شبِ تار میں دِل بہلتا رہے

وہ جلا کر نہ رکھ دے یہ ایوانِ شر
ہاں ! شرر یونہی دل میں چمکتا رہے

او ستمگر ! اِدھر بھی اُچٹتی نظر
تا کہ میرا ارماں مچلتا رہے

دل مرا تو ہے تسکینِ حریفِ ستم
غم نہیں، تیرِ غم کا جو چلتا رہے

زخمِ نو کے باب میں زخمِ کہن کی بات ہے
قلبِ محزوں میں چراغِ انجمن کی بات ہے

انجمن میں حُسن کی افسانۂ زلفِ دراز
محفلِ عشّاق میں دار و رسن کی بات ہے

واسطہ دار و رسن سے کیا شہیدِ ناز کو
اس کے مسلک میں کہاں گور و کفن کی بات ہے

اُن کے ہاتھوں ہے چمن بندی کا سارا اہتمام
جن کی دنیا میں فقط رنگیں کفن کی بات ہے

مُسکرا اُٹھّی کلی دل کی نئے انداز سے
آج گلشن میں یہ کس غنچہ دہن کی بات ہے؟

یادِ گلشن سے نہیں خالی دلِ بربادِ غم
شامِ غم میں بھی یہاں صبحِ وطن کی بات ہے

کس سے کیجے شکوۂ ناقدریٔ شعر و سخن
اب کہاں تسکیں یہاں اربابِ فن کی بات ہے ★

جگر کی اپنے تپش تا ابد بجھی ہوتی
تمہی نگاہ سے ہم نے کبھی جو پی ہوتی

جو تیری شکل صنوبر نے دیکھ لی ہوتی
تو فرطِ شرم سے حالت بدل گئی ہوتی

فنا کا درس جو شبنم سے ہم نے لئے ہوتے
ہمارے غم کی بھی رُوداد دوسری ہوتی

بدل کے رکھ دئے ہوتے، جو شرحِ الفت ہم
کہانی شہرِ نگاراں کی اور ہی ہوتی!

تڑپ تڑپ کے قفس ہی میں جان دینی تھی
چمن کی یاد جو دل سے نکل گئی ہوتی

جو ملتی تیری توجّہ، تو باہزار الم
تمام عمر میں اِک آہ بھی نہ کی ہوتی،

سہارا تیری نگہہ کا جو مِل گیا ہوتا
تو زِیست برق کی زد میں بھی کاٹ لی ہوتی

ہے اضطراب ہی اُلفت کی جان اے تسکینؔ
نہ ہوتا یہ بھی تو کیا خاک زندگی ہوتی!

★

(۱۲۵)

بسائی تھی کبھی میں نے بھی اِک دنیا تمنّا کی!
بدل کر رہ گئی اب تو کہانی میری دُنیا کی!

اٹھا لے ساغر و صہبا مرے آگے سے اے ساقی
نگاہیں تیری کافی ہیں، ضرورت کیا ہے مینا کی!

رُلائے خوں کے آنسو اُن نگاہوں کے تصوّر نے
کبھی بھولے سے بھی ہم نے کبھی جو بات صہبا کی

خوشا ضبطِ الم! روکا اُمڈتے اشک کو ہم نے
بہ آسانی رُکی ہے کب روانی چڑھتے دریا کی

بفیضِ عشق ہم تو بیخودی تک آ گئے ایسے
کہ آتی ہیں فضائیں نہ اُس گلشن کی نہ صحرا کی

مری خود اعتمادی ہے، مکمّل شاعری تسکیںؔ
ہوئیں تو لاکھ تنقیدیں، مگر کب میں نے پروا کی!

★

ہے وہ ضامنِ بقا کب جو قیام تک نہ پہنچے
اُسے کہیئے نقشِ فانی جو دوام تک نہ پہنچے!

اُسے کہیئے میکدہ کیوں جو یہ نظمِ میکدہ ہو
لیے ہے کوئی غرقِ بادہ کوئی جام تک نہ پہنچے

مری زندگی کا عنواں رہے حرفِ نامکمّل
یہ فسانۂ الم بھی جو تمام تک نہ پہنچے

یہی غم ہے کارفرما پسِ پردۂ محبّت
ہوا سامنا بھی اُن کا تو کلام تک نہ پہنچے

یہاں دل کو شاق گذرے بھلا کب اسیر ہونا
اُسے دل کہیں گے کیوں ہم جو یہ دام تک نہ پہنچے

مری بے خودی سلامت کہ جنوں ہے اپنا رہبر!
کوئی وجہ ہے جو منزل مرے گام تک نہ پہنچے

اُسے کیا ہو قُرب حاصل، کبھی بارگاہِ دل کا
جو خواص تک تو پہنچے، جو عوام تک نہ پہنچے

وہی عشق کی ہے منزل جسے یوں سمجھ لے تسکیںؔ
جہاں صبح کا چلا بھی کوئی شام تک نہ پہنچے

★

کون تجھ کو بھی کہے بالیں پہ آنے کے لئے
اور یوں دل کی لگی خود ہی بڑھانے کے لئے

مٹ گئے تو مل گیا تیرا نشاں او بے نشاں
جیتے جی تڑپا کئے ہم تجھ کو پانے کے لئے

رہبری جس کی رہی ہے مشعلِ راہِ فنا
ہے وہ رہبر اب کہاں راہیں بتانے کے لئے

کیوں نظر در سے مری رہ رہ کے لگ جاتی ہے یوں
ہیں اجل کے ساتھ ہی کیا وہ بھی آنے کے لئے

ذکر کیسا آشیاں کا، گلستاں کی یاد کیا
تھے فریبِ دام میں ہم خود ہی آنے کے لئے

فائدہ اظہارِ غم سے کیا مجھے اے ہمنشیں
درد تو شئے ہے فقط دل میں دبانے کے لئے

بزم سے ساقی تری اک اور شعلہ لے چلے
تشنگی دل کی جو آئے ہم بجھانے کے لئے

یورشیں ہیں بجلیوں کی، ہے فضا ہمّت شکن
کیا کرے ایسے میں کوئی آشیانے کے لئے

گرم ہے محفل اُدھر نظروں کے دورِ جام سے
وقف ہیں ہم تو اِدھر بس غم ہی کھانے کے لئے

جانے کیوں چلنے لگی اُس دم نسیمِ یاس بھی
شمعِ اُلفت میں نے چاہا جب جلانے کے لئے

انتظارِ آمدِ فصلِ بہاراں تا بکے؟
ہے قفس ہی میں تڑپ کر جان جانے کے لئے!

گلشنِ فانی میں تسکیںؔ ذکر کیا تسکین کا
شوقِ گُل میں ہم تو ہیں آنکھیں بچھانے کے لئے

(۱۲۸)

کسی بیہوشش کا دل میں کچھ نشاں ہے
یہی ناموسِ غم کا پاسباں ہے

اُٹھائے بارِ غم دل بھی کہاں تک
بھلا کب اِس کے قابل ناتواں ہے

ہے پُرزہ پُرزہ دامن آرزو کا
فضا میں منتشر اِک داستاں ہے

رفیقِ بےکسی ہیں رنج و راحت
ہنسی کے ساتھ آنسو بھی رواں ہے

بنے شاخِ نشیمن گُل نشاں کیوں؟
ہمارا باغباں کب مہرباں ہے!

رُخِ رنگیں سے پھولوں کا تقابل!
خزاں بر دوش جیسے گلستاں ہے

جہاں ہوتی رہی ہے برق پاشی
وہیں پر دیکھو اپنا آشیاں ہے

ہوئے ہیں جب سے مانوسِ قفس ہم
تصوّر میں قفس بھی بوستاں ہے

نہ ٹوٹا سلسلہ راہِ عدم کا
مسافر کارواں در کارواں ہے

رہِ حق میں کٹا یا جس نے سر کو
اُسے حاصل حیاتِ جاوداں ہے

گلہ تسکینِ فن کا کس سے کیجے
سخن کا بھی کوئی اب قدرداں ہے؟ ★

ترا سودا ابھی اب جائے کہاں سے!
گذرنا ہے ابھی تو اپنی جاں سے
مکاں دل کا ہے روشن لامکاں سے
یہ شمعِ طور ہم لائے کہاں سے؟
کوئی واقف ہو کب سِرِّ نہاں سے
پتہ پائے جو گذرے اِس جہاں سے!
کئے جاتا ہوں تعمیرِ نشیمن!
لگا ہے مجھکو تعلّق آسماں سے!
اماں ملتی نہیں برقِ تپاں سے
اُسے ہے بیر میرے آشیاں سے
درِ میخانہ ساقی باز رکھنا
اُٹھے ہیں ہم ابھی خوابِ گراں سے
حقیقت اُن سے وابستہ ہے اپنی
کھُلے، پردہ ہٹے جب درمیاں سے

نہاں تخریب ہے تعمیرِ نَو میں
عیاں ہے انقلابِ آسماں سے

اُدھر منزل ہماری منتظر ہے
اِدھر بچھڑے ہیں اپنے کارواں سے

یہ ہر سو حشر ساماں ہیں مناظر
کہیں ٹوٹے نہ بجلی آسماں سے

مِلے جس کا نہ ثانی اِس جہاں میں
چُنا وہ پھُول میں نے گلستاں سے

نہ دیکھا فرق ہست و بُود میں کچھ
وہیں پہنچے، چلے تھے ہم جہاں سے

کروں تسکین کب ایسی جسارت
اُٹھاؤں سر جو اُن کے آستاں سے

★

بُتکدہ چندن سے روشن اور حرم کافور سے
خانۂ دل ہے فروزاں اک چراغِ طور سے
شعلۂ حُسنِ خودی ہے پرتوِ حسنِ ازل
ہے حقیقت اپنی روشن جلوۂ مستور سے
رفتہ رفتہ زلف اُن کے رُخ سے یوں ہٹتی گئی
جیسے نکلے مہر انور اک شبِ دیجور سے
سر بکف اے کاش تو ہو زندگی کی راہ میں
پھر تو چومے پاؤں تیرے صبحِ منزل دُور سے
نوکِ مژگانِ ستمگر دل کو بخشے تو خلش
حرفِ مطلب خود ادا ہو گا ہر اک ناسور سے
بجلیاں ہنس ہنس کے دل پر وہ گراتے ہی رہے
کب رہا ہے واسطہ مسرور کو رنجور سے!

کیا کہے تسکینؔ فنا کیا ہے، بقا کیا عشق میں
کیا مذاقِ عشق ہے، پوچھو ذرا منصور سے!

(۱۳۱)

میکدے کا نظام برہم ہے
دور میں آج ساغرِ سم ہے!
ساغرِ سم بھی دو تو کیا غم ہے
یوں بھی احساں تمہارا کیا کم ہے!
زندگی جبکہ مستقلِ غم ہے
غم سے گھبرائیں کیوں، ابھی دم ہے!
کشمکش ہے، عجیب عالم ہے
زندگی موت سے بھی کیا کم ہے!
نام جس کا ہے زندگی شاید
وہ بھی اے دل فریبِ محکم ہے
کارفرما ہے خونِ حسرت کا
قصۂ دل میں کاوشِ غم ہے
اپنی وارفتگی کو کیا کہئیے
پوچھتا ہوں کہ منزلِ غم ہے؟

درس کیوں لیں فنا کا گُل سے ہم
ترجمانی فنا کی شبنم ہے
سیلِ اشکِ رواں پہ کیا قابو
ضبطِ اشکِ الم ہے کیا کم ہے!
نالۂ دل رسا نہیں ہوتا
شورشِ درد کس قدر کم ہے!
کاش آئے بھی کوئی پروانہ
شمعِ حسرت کی لَو بھی مدّھم ہے
دیکھ کر فیض آج ساقی کا
زُہد کا بھی کچھ اور عالم ہے
یہ بھی اک رُخ ہے زیست کا تسکیںؔ
زندگی آج وقفِ ماتم ہے!

نظر میں گردشِ ایّام بھی ہے
دلِ محزوں رہینِ جام بھی ہے

کہیں ٹکرا گئے ساغر سے ساغر
کہیں ساغر برائے نام بھی ہے

سرِ مقتل کوئی پامالِ حسرت
کہیں دیکھو تو قتلِ عام بھی ہے

عجب ہے رشتۂ حُسن و محبّت
وہ ہے معصوم، یہ بدنام بھی ہے

جفائے حُسن معراجِ محبّت
یہی نامِ خُدا انعام بھی ہے

۲۳۷

کہاں جائے رُخِ رنگیں کا سودا
جنوں کو فصلِ گُل سے کام بھی ہے

فغاں کیسی، کہاں کا حرفِ شکوہ
مرا دل خوگرِ آلام بھی ہے

جدھر دیکھو اُدھر جلوہ پرستی
ترا جلوہ مذاقِ عام بھی ہے؟

اُدھر پیکاں، اِدھر ہے مضطرب دل
مجھے تسکیں، کبھی آرام بھی ہے؟

عجب دُنیا ہے اِن رنگیں جمالوں کی حسیں اپنی
کہانی جس سے وابستہ ہے اب تک ہمنشیں اپنی

جو آیا سامنے اُس کے اُسے دیوانہ کر ڈالا
دکھائی اُس نے صورت بھی بایں صورت کہیں اپنی

نشانہ تھا جہاں بجلی کا، گرتی تھی جہاں بجلی
خوشا ہمّت! کہ طرحِ آشیاں ڈالی وہیں اپنی

ستم ڈھاتے ہیں رہ رہ کر زمیں والے زمیں پریوں
کہ جیسے ہوگی پُرسش ہی نہ کچھ زیرِ زمیں اپنی

بھلا تیرے شہیدوں کے قریں کب موت آئے گی
اُسے کہہ دے کہ پوری کر لے حسرت اور کہیں اپنی

فلک بھی بَیر رکھتا ہے، زمیں بھی جب مخالف ہے
تو پھر دعویٰ یہ باطل ہے فلک اپنا، زمیں اپنی

حقیقت ہے، مکاں سارا جہاں ہے لامکاں ہی کا
مگر پھر بھی کوئی مخصوص جا اُس کی نہیں اپنی

نہیں کچھ قید اُس کے آستانے کی تو پھر تسکیں
جُھکا لُوں گا جبیں حُسنِ عقیدت میں کہیں اپنی

نگاہوں ہی نگاہوں میں اُنہیں اپنانے جائیں گے
ذرا ساغر سے ساغر آج ہم ٹکرانے جائیں گے

نہیں کچھ قید اُس کے آستانے کی تو پھر ہمدم
خوشی سے ہم کبھی کعبہ، کبھی بُتخانے جائیں گے

ہر اک جھنکار پابندِ سلاسل کی صدا تیری
ترے دیوانے شاید دور سے پہچانے جائیں گے

چمن میں فصلِ گُل آنے تو دو پھر فیصلہ ہوگا!
کہاں جائیں گے دیوانے، کہاں فرزانے جائیں گے

نظر ہو گی جو اے ساقی تری ساغر بکف پیہم
تو پھر کس میکدے کی سمت ہم مستانے جائیں گے

بہارِ عارضِ رنگیں بھی مخفی ہو نظر سے جب
دلِ وحشت زدہ کو ہم کہاں بہلانے جائیں گے

نہ آئیں راس ان کو باغِ ہستی کی فضائیں کچھ
الٰہی ! پھر تری جانب ترے دیوانے جائیں گے

مذاقِ عشق بدلا ہے، نہ بدلے گا کبھی لِتسکیں
بجھے گی شمع بھی کب اور کب پروانے جائیں گے

★

(۱۳۵)

نگاہوں کا سہارا کم نہیں ہے

خوشا قسمت! مقامِ غم نہیں ہے

میں اِن آنکھوں میں گویا کھو گیا ہوں

مری یہ بے خودی بھی کم نہیں ہے

فقط ہے سلسلہ تارِ نظر کا!

کچھ اُن سے رشتۂ محکم نہیں ہے

وفا نا آشنا ہے حُسنِ خود بیں!

چراغِ عشق بھی مدّھم نہیں ہے!

یہی غم تو ہے جُزوِ زندگانی

دلِ نازک پہ بارِ غم نہیں ہے

سرشکِ خوں مژہ پر آج تسکیں

سکوں پرور ہے منظر، غم نہیں ہے

(۱۳۶)

میں سوزِ غم سے جلتا ہوں، مجھے آتش بجاں سمجھے
خوشی سے کیا غرض مجھ کو، کوئی کیوں شادماں سمجھے

گراں گذرے گی کیا فصلِ بہاراں اُس کے دل پر بھی
قفس میں خود کو جو صیّاد کا اِک میہماں سمجھے

اِسی اِک داغِ الفت سے ہے روشن دل کا کاشانہ
رہے محروم جو اِس سے وہ کب رازِ نہاں سمجھے!

وہ کیا جانے، وہ کیا سمجھے، نیاز و نازِ گُلشن کے
قفس کی تیلیوں کو جو ازل سے گُل نشاں سمجھے

اثر ہے برق کا جب تنکے تنکے میں نشیمن کے!
تو پھر خطرے سے خالی کوئی کیوں کر آشیاں سمجھے

مری روداد غم کو شکوہ سنجی کیوں سمجھتے ہو
زباں رکھتے ہوئے شاید مجھے تم بے زباں سمجھے

مثالِ شمع سر اپنا کٹا دے زیست کی خاطر
ہے زندہ وہی جو زندگی کو امتحاں سمجھے

دلِ مضطر کی بیتابی سے اب تسکیں ملی تسکیں!!
جسے کہتے تھے مدفن ہم، اُسے دارالاماں سمجھے

★

(۱۳۷)

وہ جانِ صد بہار آئے نہ آئے
مجھے ہے انتظار، آئے نہ آئے

تم اپنی سرکشی کی لاج رکھنا
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

ترے احسان ہی کیا کم ہیں مجھ پر
غموں کا دل پہ بار آئے نہ آئے

تجھے دیکھا گئے ہم یہ سمجھ کر
یہ جلوہ بار بار آئے نہ آئے

ترے کشتوں کو کیا مطلب فنا سے
مرے قدموں میں دار آئے نہ آئے

ہمارے سر میں سودا ہے اُسی کا
نظر وہ جلوہ بار آئے نہ آئے

باندازِ قفس ہے آشیاں جب
ہمیں غم کیا بہار آئے نہ آئے

ترے دل کا نہ شیشہ ہو مکدّر
مرے دل پر غبار آئے نہ آئے

لئے جاتا ہے خود شوقِ شہادت
نظر وہ رہگزار آئے نہ آئے

نہ کیوں دل میں بسا لیں اُس کی خوشبو
نظر وہ گلعذار آئے نہ آئے

رہینِ گردشِ جامِ نظر ہوں
مجھے تسکیں خمار آئے نہ آئے

★

۱۳۸

کیا ہوتا ہے عالم بھی یہ عالمِ تنہائی
احساس یہ ہوتا ہے اب آئی قضا آئی

دیکھی جو کسی گُل کی میں نے کبھی رعنائی!
حسرت دلِ مضطر کی لینے لگی انگڑائی

پھر دیکھ لیا اُس نے اندازِ صف آرائی
پھر وقت کے ماتھے پہ اِک بار شکن آئی

مُرجھانا مقدّر ہے اُس غنچۂ خاطر کا
بخشی نہ گئی جس کو کلیوں کی سی رعنائی

داغِ شبِ ہجراں سے آباد ہے غمخانہ
محفل کی ہے محفل یہ تنہائی کی تنہائی

امواجِ حوادث سے ہوتا ہے ہراساں کیوں
پہنچا نہ دے پستی میں تجھ کو یہی پسپائی

لُٹ جائیں تو لُٹ جائیں اِس دَور کے ہاتھوں ہم
جانے نہ دیں ہاتھوں سے دامانِ شکیبائی

کیا کہیئے نظارا ابھی اُس شاہدِ معنیٰ کا
مفقود ہوئی جیسے یہ قوّتِ بینائی

لے دے کے ہمیں تو ہیں کونین میں اے تسکین
ہم خود ہی تماشا ہیں، ہم خود ہی تماشائی

نجانے کتنے آئے اور یہاں سے شادماں گزرے
ہمیں گلزارِ ہستی سے فقط ماتم کُناں گزرے

قفس ہی آشیاں اپنا، قفس ہی گلستاں اپنا
تو پھر اے دل ہمیں کیوں کر خیالِ آشیاں گزرے

چمن والو! چمن سے دُور رہنے دو ابھی مجھکو
مبادا گریۂ شبنم مرے دل پر گراں گزرے

کٹی ہے یوں تو ساری عمر اپنی رنج و کلفت میں
خُدایا کوئی لمحہ تو خوشی کے درمیاں گزرے!

تقاضا ہے یہ اُلفت کا کہ دل کا دل سے سودا ہو
کہیں ایسا نہ ہو لیکن زمانے کو گراں گزرے

نظر کب سے ہے اپنی منتظر فصلِ بہاراں کی
نظر اب تو بہارِ بے خزاں کے درمیاں گزرے

یہی بیتابیاں تو جانِ اُلفت کی ہیں اے تسکیں
اگر حاصل نہ ہو تسکیں، تو کیوں بارِ گراں گزرے ★

(۱۴۰)

عجب ایماں شکن صورت گری معلوم ہوتی ہے
بتوں کی ہر ادا میں دلکشی معلوم ہوتی ہے

قیامت! سازِ الفت کی کمی معلوم ہوتی ہے
فضائے دہر میں اک خامشی معلوم ہوتی ہے

نظر میں گھومتا ہے غنچۂ خاطر کا مُرجھانا
کلی کو دیکھتے ہی بیکلی معلوم ہوتی ہے

خُدا رکھّے! عجب دنیا ہے اِن رنگیں جمالوں کی
جدھر دیکھو اُدھر ہی دلکشی معلوم ہوتی ہے

غضب ہے ساغرِ مئے کی بھی گردش دستِ رنگیں میں
پری کے ہاتھ میں رقصاں پری معلوم ہوتی ہے

اِسی اِک داغِ الفت سے ہے روشن دل کا کاشانہ
اِسی کی مجھ کو دُنیا میں کمی معلوم ہوتی ہے

تصوّر نے ترے تسخیر مجھ کو کر لیا ایسا
نظر جس شے پہ جاتی ہے پری معلوم ہوتی ہے

میں برباد تمنّا ہوں، خوشی سے کیا غرض مجھ کو
مری یہ زندگی اب دوسری معلوم ہوتی ہے

کچھ ایسا آشنا بیتابیوں سے ہو گیا تسکیں
کہ دردِ دل میں بھی مجھ کو کمی معلوم ہوتی ہے

اِس درجہ کشش تجھ میں اب تو اَے جذبۂ کامل آجائے
قاتل کا تصوّر کرتے ہی بس سامنے قاتل آجائے

ہمّت جو سہارا دے مجھ کو، طوفاں بھی سکوں کا مرکز ہو
ہر موج میں ساحل آئے نظر، ہر گام پہ منزل آجائے

پھر پردۂ ظلمت ہٹ جائے، پھر نقشۂ باطل مِٹ جائے
اُس شاہدِ رعنا کا جلوہ جب دل کے مقابل آجائے

اِک بات نئی پھر پیدا ہو، پھر لُطفِ تماشہ کیا کہیئے!
مقتل کے مناظر دلکش ہوں جب لے رقص میں بسمل آجائے

ہے کون کسی کا دنیا میں، جو ہے وہ غرض کا بندہ ہے
ہمدم بھی جُدا ہو جاتے ہیں، جب ہم کو کوئی مشکل آجائے

تسکیںؔ یہ مصائبِ دنیا کے ہنس ہنس کے گوارا کرتا جا
ہمّت کا نہ دامن چھوڑ کبھی مشکل پہ جو مشکل آجائے

(۱۴۲)

اُن کے فراق میں یہ مرا حالِ زار ہے
اشکِ رواں نہیں ہیں کوئی آبشار ہے
کیا ذکر اُن کا لب پہ مرے بار بار ہے
گویا دلِ حزیں کو مرے یوں قرار ہے
اِک عمر کا ہے ساتھ نہ ہو اُنس کس طرح
اب درد ہی سے دل کو ہمارے قرار ہے
ہر قطرہ اشکِ غم کا ہے گنجِ مرادِ دل
دامن پہ میرے گر کے دُرِ شاہوار ہے
ہو جائے گا کبھی تو مداوائے دردِ دل
پھر شاہراہِ زیست میں کیوں خلفشار ہے
شوخی نگاہِ مست کی بتلا رہی ہے صاف
جیسے شرابِ حُسن کا چڑھتا خمار ہے
برسیں گے قطرے خون کے ابرِ بہار سے
گلشن میں عندلیب ہی جب اشکبار ہے

گلزارِ عشق بھی کسی مقتل سے کم نہیں
جس صیدِ غم کو دیکھئے وہ دلفگار ہے
کرنے لگی ہے توبہ بھی میکش سے ساز باز
کیا میکدے پہ جھوم کے آئی بہار ہے؟
معلوم ہے بنے گا چمن میں جو آشیاں
برگشتگیٔ بخت کا کیا اعتبار ہے
یوں تو یہ زندگی ہی سراسر ہے ایک بار
غم جبکہ جُزوِ زیست ہے، کیا غم کا بار ہے!
ساقیٔ غم نواز کے قربان جائیے
روزِ ازل جو پی تھی اُسی کا خمار ہے
میرا سلام دامنِ حرمت نواز کو!
سنتا ہوں میں کہ آمدِ فصلِ بہار ہے
مستی بھری نظر نے پلایا وہ تلخ جام
اب تک نہیں ہے ہوش یہ کیسا خمار ہے؟
تسکینؔ اُلجھ نہ دامِ ہوا و ہوس میں تو
اب تیری زندگی کا کوئی اعتبار ہے؟

★

مرے چاکِ گریباں پر ستمگر کی نظر ہو گی
مری وحشت ہی شاید دردِ دل کی چارہ گر ہو گی

کرامت ہے محبت کی، جدھر دیکھوں اُدھر ہو گی
تری تصویرِ جاں پرور مرے پیشِ نظر ہو گی

یہی بیتابیاں ہوں گی، یہی ہنگامۂ حرماں
مقرر! صبحِ محشر بھی شبِ غم کی سحر ہو گی

یونہی منہ دیکھتی رہ جائیں گی رنگیں بہاریں بھی
نظر سارے زمانے کی تری تصویر پر ہو گی

چھپائے سے چھپی ہے داستانِ عشق و الفت کب
جہاں تک کیجئے مخفی وہیں تک مشتہر ہو گی

توہی اَے شمعِ محفل اِک نہیں بربادِ سوزِ دل
شبِ غم میں ہماری زندگی بھی مختصر ہوگی

میں بربادِ تمنّا ہوں خوشی سے کیا غرض مجھ کو
نہ کوئی شام ہو جس کی تو کیا اُس کی سحر ہوگی

وہ کیا صورت دکھائیں گے کسی پامالِ حرماں کو
یہاں تو شامِ غم گھیرے ہے کب اپنی سحر ہوگی

چلیں گے جام لاکھوں ایک گردش میں نگاہوں کی
لئے میخانے کا میخانہ ساقی کی نظر ہوگی

گھٹا خود جھوم کر برسیگی رندوں کی دعاؤں سے
سیہ کاروں کی جانب ہی کرم پرور نظر ہوگی

اِدھر تسکینِ سکونِ دل کی خاطر مضطرب ہوگا
اُدھر ناوک لئے ظالم کی چشمِ فتنہ گر ہوگی ★

میں سوزِ غم سے جلتا ہوں مجھے آتش بجاں کہئے
خوشی سے کام کیا مجھ کو مجھے کیوں شادماں کہئے

سمجھئے اب کسے ہمدم، کسے اب ہمزباں کہئے
ہوا کا رُخ ہی جب بدلا ہو کس سے داستاں کہئے

مصائب کے تلاطم میں بھی جو انساں رہے شاکر
اُسے رازِ محبّت کا نہ پھر کیوں رازداں کہئے

نہیں پابندیِ دیر و حرم سے کام عاشق کو
جُھکے جس جا جبیں اپنی اُسی کو آستاں کہئے

ثبوتِ عہد و پیمانِ وفاداری پہ گر شک ہے
تہہِ خنجر گلا رکھ دوں بوقتِ امتحاں کہئے

کٹا یا جس نے سر اپنا رہِ حق میں، رہا باقی
یہی وہ موت ہے جس کو حیاتِ جاوداں کہئے

اُدھر مژگاں کے ناوک ہیں، اِدھر سینہ سپر کوئی
یہ وہ رنگین افسانہ ہے جس کو جانستاں کہئے

چھُٹی ہے اس طرح افشاں جبینِ ناز پر اُس نے
کہ افلاکِ جفا پرور کی اُس کو کہکشاں کہئے

یہی اک درد جب اُٹھ اُٹھ کے لیتا ہے خبر دل کی
اِسے پھر کیوں نہ اپنے غمکدے کا پاسباں کہئے

دلِ مضطر کی بیتابی سے اب تسکیں ملی تسکیں
جسے مدفن سمجھتے ہیں، اُسے دارُ الاماں کہئے

(۱۴۵)

اپنا یہ ادھورا افسانہ، تمہیدِ بیانی کیا جانے!
دونوں ہی سرے ہوں گم جس کے وہ اصل کہانی کیا جانے
لکھا ہی گیا ہے قصۂ دل ارمانوں کے خوں کی سرخی سے
جس میں نہ ہو درد و غم کی خلش، دل ایسی کہانی کیا جانے
کیا ہوتی ہے اُلفت کی دُنیا، کیا کیا ہیں محبّت کی شرطیں
پابندیِ رسم و راہِ وفا معصوم جوانی کیا جانے
آلام و مصائب کی کڑیاں جھیلی نہ ہوں جس کے دل نے کبھی
اوروں کی وہ بیتی کیا سمجھے، اوروں کی کہانی کیا جانے
گھُل گھُل کے تپِ فرقت سے جگر کس طرح لہو بن جاتا ہے
جو سوزشِ غم سے دور رہا، وہ اشک فشانی کیا جانے
دن رات جو جلتا رہتا ہو خود آتشِ عشقِ احمدؐ میں
وہ نقشِ فنا کو کیا سمجھے، وہ عالمِ فانی کیا جانے
فرزندِ نبیؐ کی اے تسکیںؔ رودادِ الم میں کس سے کہوں
جو خود نہ رہا ہو تشنہ دہن، وہ تشنہ دہانی کیا جانے

(۱۴۶)

اگر پیشِ نظر وہ حُسنِ عالم گیر ہو جائے
تو پھر یہ خانۂ دل، خانۂ تنویر ہو جائے

رہیں ساقی کی نظریں گر یونہی ساغر بکف پیہم
عجب کیا، میکدے کا میکدہ تعمیر ہو جائے

کشش ہے کونسی ایسی، لگاوٹ ہی تو کس ڈھب کی
تری تصویر جو دیکھے، وہ خود تصویر ہو جائے

ہمارا جذبۂ اُلفت اثر اتنا تو دکھلائے
نظر جس شے پہ ڈالیں ہم، تری تصویر ہو جائے

گھٹائیں اُٹھ رہی ہیں اِس طرح رحمت کی ہر جانب
عجب کیا، پھر مرا دل مائلِ تقصیر ہو جائے

نظر آئیں تصوّر میں اگر مژگانِ صید افگن
تو ہر تارِ نظر اپنے جگر میں تیر ہو جائے

چمن والو! چمن سے دُور رہنے دو ابھی مجھ کو
عجب کیا، مجھ سے سرزد پھر کوئی تقصیر ہو جائے

خوشا قسمت! عظیم آباد میں تسکینؔ، غزل خواں ہے
عجب کیا، اس کو حاصل شعر کی جاگیر ہو جائے

★

کس کی حدیثِ دل میں اُتارے چلے گئے
جلووں کی سمت کس کے سہارے چلے گئے

راہِ فنا میں کوئی نہ رہبر ہی جب رہا
ہم اپنی راہ آپ سنوارے چلے گئے

شبنم کی طرح عمر تو روتے ہی کٹ گئی
بے کیف زندگی تھی گزارے چلے گئے

کیا ماجرا ہے بحرِ محبّت میں اے خُدا؟
جتنا بڑھا کئے وہ کنارے چلے گئے

اُن سے نظر ملی کہ ملی برق سے نظر!
کیا کیا نظر میں ٹوٹتے تارے چلے گئے

ہم کائناتِ قلب و جگر اے تپِ فراق!
عکسِ خیالِ یار پہ وارے چلے گئے

تسکیں ملیں ملیں نہ ملیں وہ تو کیا ہے غم
پیہم اُنہیں کو ہم تو پکارے چلے گئے ☆

پہلے بھی تو یوں ہم روتے تھے، اشکوں کی جھڑی دن رات نہ تھی
اب کون کہے، کیا ہوتا ہے، ایسی تو کبھی برسات نہ تھی

اُلفت کے دِیئے، اشکوں کے گہر، دو ہی تھے سہارے ہجر کی شب
پُر کیف تھے منظر پیشِ نظر، تاریک وہ گویا رات نہ تھی

اِس دل میں لگن پیہم نہ رہی، اِک بار وہ ملتے کاش کہیں!
لیکن نہ ملے، کب ملتے بھی، فطرت میں یہ اُن کی بات نہ تھی

مُدّت سے مکینِ دل وہ رہے، اب روٹھ گئے، کیا بات ہوئی!
کر لیتے بسر پھر دل میں اگر، اِک بات تھی اور کچھ بات نہ تھی

کچھ بھی نہ لئے دنیا سے چلے، آشفتہ ہوئے جب اُن سے ملے
کرتے تو بھلا کیا نذر اُنہیں ایسی تو کوئی سوغات نہ تھی

ہم خاک سے بن کر خاک ہوئے اور خاک نہ سمجھے خاک کو ہم
قدرت ہی کو اس میں دخل رہا، یہ اور کے بس کی بات نہ تھی

اِس عالمِ فانی میں تسکیں، تا زیست ہمیں تسکیں نہ ہوئی
ہوتی بھی تو ہوتی کیسے بھلا، قسمت میں تو ایسی بات نہ تھی

(۱۴۹)

تو اپنا ساغر و مینا و جام لے ساقی
کوئی یہاں سے چلا تشنہ کام، لے ساقی
جو کام غمزوں سے بالائے بام لے ساقی
تو تیرا صیدِ نظر دل بھی تھام لے ساقی

جو دَورِ ساغر و مینا میں کچھ تکلّف ہو!
تو ایسے وقت پہ نظروں سے کام لے ساقی

عجیب بات ہے، جب ذکر ہے تو غیروں کا
کبھی کبھی تو ہمارا بھی نام لے ساقی

ہے تیرے فیض کا شہرہ تو سارے عالم میں
کہیں تو زُہد کا دامن نہ تھام لے ساقی!

لبوں پہ اُس کے تصدّق مری بقا و فنا
جو کوئی تیرا محبّت سے نام لے ساقی

خُدا کے واسطے تسکیں کو آج تسکیں دے
★ تڑپتے دل کا کبھی تو سلام لے ساقی!

رشکِ صد باغِ اِرم قاتل تری محفل بھی ہے
گُل کی صورت، خندۂ زخمِ دلِ بسمل بھی ہے

ہو گیا ہوں اِس طرح وارفتہ کھو کر دل کو میں
پوچھتا جاتا ہوں سب سے عشق کی منزل بھی ہے؟

جب کِھچا جاتا ہے رہ رہ کر تری جانب یہ دل
کِس طرح سمجھیں، ہمارا دل، ہمارا دل بھی ہے

منزلِ ہستی پہ آ کر کارواں رُکتا نہیں!
اِس کے آگے اَے مسافر اور اِک منزل بھی ہے

کشتیِ اُمّید کا اب دیکھئے کیا حشر ہو
پُرخطر منجدھار بھی اور پُرخطر ساحل بھی ہے

مرنا جینا، جینا مرنا، یوں اشارے پر ترے
کس قدر آسان ہے اور کس قدر مشکل بھی ہے

اُس طرف چٹکی کلی اور مرغِ بسمل ہو گیا
اَللہ اَللہ کس قدر نازک ہمارا دل بھی ہے

جان ہیں دُنیائے اُلفت کی یہی بیتابیاں
کیا کہا تسکیں، تجھے تسکین اب حاصل بھی ہے

(۱۵۱)

اِس طرح رنج والم سے دل مرا دوچار ہے
جس طرح پہلو میں کلیوں کے وجودِ خار ہے

بھا گیا کس شاہدِ رعنا کا اندازِ کلام
ہر نفس نامِ خدا دیکھو تو نغمہ بار ہے

حشر تک کھاتے ہی جائیں گے فریبِ حشر ہم
کیا قیامت خیز بھی ظالم تری رفتار ہے

کاٹتی ہے زندگی تو شمع کی مانند کاٹ
زندگی تو ہے اُسی کی غم سے جو دوچار ہے

رہگذارِ عشق میں حاصل اُسی کو ہے فراز
جس نے سمجھا اپنی منزل کو مقامِ دار ہے

رنگ پر آتا ہے کب یہ دردِ دل تو دیکھئے
جب مری آنکھوں کو حاصل یار کا دیدار ہے

ہے گذرنا لازمی اس رہگذر سے سر بکف
باندھئے سر سے کفن یہ کوچۂ دِلدار ہے!

بحرِ گوھر زا ہے چشمِ پُر اَلم اپنی بھی کیا
قطرہ اِک اِک اشک کا گویا دُرِ شہوار ہے

کیوں نہ تڑپائیں تڑپ کر ہم بھی اس کو ایکدن
جب زمانے کا زمانہ درپئے آزار ہے

ہم ہیں نغمہ سنج لشتگیں آج "دانا پور" میں
ہے صدائے دل غزل کیوں کر کہیں شہکار ہے

مذاقِ درد و محبّت جو عام ہو جائے
فسانہ دَورِ جنوں کا تمام ہو جائے

بنا دو شمعِ محبّت کا اپنی پروانہ
تمہارے ساتھ ہمارا بھی نام ہو جائے

تری نگاہ جو ساغر بکف لئے ہے پیہم
تو زندگی مری پھر نذرِ جام ہو جائے

ملے نہ جس کو اشارہ نگاہِ ساقی کا
قسم ہے میکدہ اُس پر حرام ہو جائے

کریں جو پچھلی روایات آج تازہ ہم
زمانہ پھر تو ہمارا غلام ہو جائے

کچھ ایسا کیجیے اس کارزارِ ہستی میں
کہ آپ کا بھی شہیدوں میں نام ہو جائے

تمہارا جلوہ جو دل میں ہمارے گھر کر لے
تو دل ہمارا بھی رفعت مقام ہو جائے

ستارہ بخت کا رخشاں ہو آج اے تسکیں
قبول اُن کو جو میرا سلام ہو جائے

ہر لمحہ اذیّت ہے، ہر لمحہ پریشانی
ہم تجھ کو نہ بھولیں گے اَے دورِ ستم رانی

اُمّیدِ کرم اُن سے کب جذبۂ لاحاصل
موجیں بھی تو کرتی ہیں کشتی کی نگہبانی

اِن ہوش کے جلادوں کو اتنا تو پتا ہوگا
غنچوں کے چٹکنے کی کب ہوگی فراوانی

کیا ساقیِ دوراں کا اندازِ نظر بھی ہے
جس ذرّے کو دینا ہے، دیتا ہے یہ تابانی

اَے کاش نظر آئیں صحرا میں گُل و لالہ
مل جائے محبّت کو پھر وسعتِ دامانی

ہاں اگردشِ دوراں پر رونا جو تمہیں آئے
ہو جائے بہ یک لمحہ پتھّر کا جگر پانی

ہر زخم کھُرچ ڈالو تُم ناخنِ ہمّت سے
ایسا نہ ہو بڑھ جائے کچھ اور پریشانی

ہُشیار ہی رہنا ہے اب وقت کے اژدر سے
ڈس لے نہ کہیں تُم کو یہ ناگ بآسانی

اسرارِ خودی تُم پر کھُل جائیں اگر تسکیں
دُنیا میں تمہیں کیوں ہو پھر ایسی پشیمانی

★
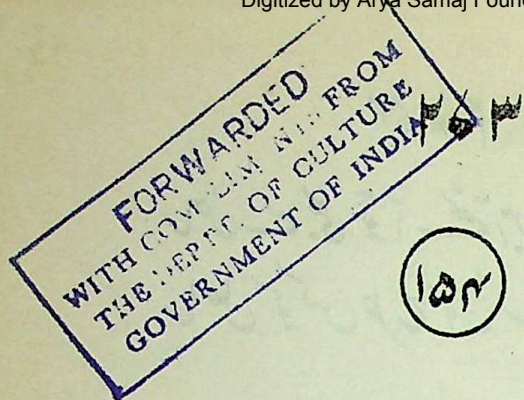
اے کاش اپنے رُخ سے وہ پردہ ہٹا سکے
موسیٰ صفت ہمیں بھی گھڑی بھر بنا سکے

یارب ہمارے دل کو وہ جذبہ تو کر عطا
مشکل پہ باتوں باتوں میں غلبہ جو پا سکے

روتے ہیں عمرِ رفتہ کی رنگینیوں کو ہم
کس سمت کو گئیں کہ انہیں پھر نہ پا سکے

وابستگی کچھ ایسی ہو ملّت کے نام سے
چاہے زمانہ بھی تو نہ تم کو مٹا سکے

روشن کرو وہ شمع کہ ظلمت بھی لے پناہ!
اِستم چلے بھی تو غالب نہ آ سکے

ساحل سے بھی تو اُٹھتے ہیں طوفاں نئے نئے
ساحل کو کس طرح کوئی ساحل بنا سکے

ایسے نسیمِ یاس کے جھونکے ہیں ہر طرف
مشکل ہے کوئی شمعِ تمنّا جلا سکے

کٹتی ہو جس کی کشمکشِ غم میں زندگی
فرصت اُسے کہاں ہے کہ وہ مُسکرا سکے

راہِ وفا میں جو ہوا برباد آرزو
تسکیں کہاں وہ دل جو کسی سے لگا سکے

(۱۵۵)

تم اپنی جلوہ نمائی اگر نہیں کرتے!
تو ہم بھی ایسے جہاں میں بسر نہیں کرتے

جنوں کو اپنے اگر راہبر نہیں کرتے!
تو اُن کی زلفِ تغافل کو سَر نہیں کرتے

کبھی جو شوق سے درسِ سکوت لیتے ہم
تو ایک آہ بھی پھر عمر بھر نہیں کرتے

یہ تیرا در ہے کہ جس سے ہمیں عقیدت ہے
وگرنہ اور کہیں خم تو سَر نہیں کرتے

نجانے کتنی مہم عاشقوں نے سَر کر لیں
تمہاری زُلف کو لیکن یہ سَر نہیں کرتے

ہزار صبر و سکوں نذرِ غم کریں لیکن!
تمہارے دل میں تو ہم پھر بھی گھر نہیں کرتے

یہ چشمِ مست ہی کافی ہے تیری اے ساقی
نظر ہم اور کسی جام پر نہیں کرتے

یہ اور بات ہے باقی ہی رہ گئی حسرت!
کب آستیں وہ مرے خوں سے تر نہیں کرتے

اُدھر ہی دور میں رہتے ہیں ساغر و مینا
اِدھر وہ میری طرف اک نظر نہیں کرتے

زمیں پہ چلتے نظر آسماں پہ رکھتے ہیں
یہ اہلِ زر ہیں نظر خاک پر نہیں کرتے

ہم اُن کی یاد سے غافل بھی کب رہے تسکیںؔ
ہم اُن کو یاد بھی کب دار پر نہیں کرتے ★

یہ موجِ غم کی روانی رہے رہے نہ رہے
متاعِ سوز ہے فانی رہے رہے نہ رہے

پڑی ہے کیا تجھے میری بھی ساقیٔ محفل
یہ اپنی تشنہ دہانی رہے رہے نہ رہے

ہمیں بھی لُوٹو ہمارا قرار بھی لُوٹو
یہ دورِ حُسن و جوانی رہے رہے نہ رہے

دکھاؤ خنجرِ بیداد کا وہ جوہر تُم!
کہ جس کا شہر میں ثانی رہے رہے نہ رہے

غرورِ شاخِ نشیمن پہ کیوں کرے کوئی!
کہ تنکا تنکا ہے فانی رہے رہے نہ رہے

سجا کے رکھتے ہیں داغوں سے دل کی محفل ہم
عروسِ غم کی نشانی رہے رہے نہ رہے

گزارو جیسے بھی گذرے شبِ الم اپنی
کہ صبح تک یہ کہانی رہے رہے نہ رہے

اُٹھاؤ لطفِ مناظر کہ رقصِ بسمل ہے
فضا پھر ایسی سُہانی رہے رہے نہ رہے

سمو دیں کیوں نہ خودی کو ہم اُن کے جلووں میں
کہ دردِ سر کی گرانی رہے رہے نہ رہے

ابھی تو ساکھ ہماری یہاں ہے اے تسکینؔ!
اب آگے چل کے یہ پانی رہے رہے نہ رہے

دل میں یہ کس کا رکھ لیا نقشہ اُتار کے
بجھتے نہیں ہیں آئینے فصلِ بہار کے

کیوں خواب دیکھتا ہوں قفس میں بہار کے
سارے چراغ گُل ہوئے شہرِ قرار کے

کیوں میری بات بات ہے مشکوک اِس قدر
کیا دن چلے گئے ہیں مرے اعتبار کے؟

زیرِ لحد جو لے گیا میں قلبِ مضطرب!
پارہ صفت تھے ذرّے بھی میرے مزار کے

گلزارِ عشق بھی کسی مقتل سے کم نہیں!
ارماں تڑپ رہے ہیں دلِ سوگوار کے

روتا ہوں میں بہار کو فصلِ بہار میں
ساغر چھلک پڑے مرے صبر و قرار کے

دنیا جو رہگذر ہے ترے آستاں کی ایک
گم گردہ ہم ہیں راہرو اُس رہگزار کے

جس غم پہ مجھ کو ناز تھا اے ہمنشیں کبھی
بس میں ہے اب وہ گردشِ لیل و نہار کے

خود ہی نثار جن پہ ہو طولِ شبِ فراق!
لمحات ایسے ہوں گے بھی کیا انتظار کے!

تسکیں کوئی گُناہ نہ رہ جائے دیکھنا
سائے میں تم ہو رحمتِ پروردگار کے

جب لذّتِ پنہاں حاصل تھی، پھر درد کا درماں کیا کرتے
دریائے الم کے غوطہ زن تسکین کا ساماں کیا کرتے

مانا کہ بہت پُرکیف تھے دن، صحبت میں تری جو کٹتے رہے
ماضی کے مگر اک خواب سے ہم اِس دل کو پریشاں کیا کرتے

کیا موسمِ گُل ہو، کیا ہو خزاں، فرقت میں سرِ مو فرق نہیں
جب دل کی کلی مرجھا ہی گئی احساسِ بہاراں کیا کرتے

اِک دل کے سوا تھا اور بھی کیا، ہم نذر اُسے بھی کر ہی چکے
کچھ تُم ہی کہو افلاس میں ہم اب خاطرِ مہماں کیا کرتے

سامانِ چراغاں مرقد پر افلاک کے تارے کرتے ہیں!
احباب سے کیا اُمّید بھی تھی احباب چراغاں کیا کرتے

اِک اپنا سفینہ نازک اور وہ بحرِ حوادث اے تسکیںؔ
غرقاب اسے تو ہونا تھا، ہم شکوہ طوفاں کیا کرتے

★

(۱۵۹)

چھیڑا نہ کرو ذکرِ بہاراں مرے آگے
آجائے نہ پھر وحشتِ عریاں مرے آگے

زُلفِ غمِ جاناں پہ نظر جائے بھی کیوں کر
تاباں ہے ابھی گیسوئے دوراں مرے آگے

مشکل ہے کنارے سے لگے دل کا سفینہ
اشکوں کا چلا آتا ہے طوفاں مرے آگے

کیونکر بچے ایسے میں بھلا اپنا نشیمن!
ہر سمت ہیں تخریب کے ساماں مرے آگے

گُلشن میں کشش ہے نہ تو صحرا میں لگاوٹ
بےکیف ہیں اب چشمِ غزالاں مرے آگے

دیباچۂ گلشن کے ہیں الفاظ و معانی
مبہم سی جو ہے زلفِ پریشاں مرے آگے

حاصل رہی تا عمر مجھے درد کی لذّت
تشنہ ہی رہا درد کا درماں مرے آگے

آئینۂ حسرت کا ہے وہ عکسِ متوّلہ
خاموش جو ہے دیدۂ حیراں مرے آگے

اِک میرے سوا سب پہ رہی تیری عنایت
معذور رہا ہے ترا احساں مرے آگے

اعجازِ سخن رشکِ زمانہ ہوا التسکین!
سر دُھنتے ہیں کتنے ہی سخنداں مرے آگے

کیا جانے کس کی یاد میں یہ حالِ زار ہے
دل ہے کہ آپ اپنا حریفِ قرار ہے

آغوش میں خزاں کے ہے اب جانِ پُر الم
دل کو عبث ہی اب تو امیدِ بہار ہے

کیا جانے کیا گذرتی ہے جانِ حزیں پہ اب
دورِ خزاں ہے آنے کو رخصت بہار ہے

شمس و قمر گواہ کہ شاداں رہے نہ ہم
دیکھی نہ فصلِ گُل کہ خزاں آشکار ہے

مُنہ تک رہی ہیں حسرتیں، ساکت ہے آرزو
کیوں زرد زرد آج یہ رنگِ بہار ہے

تسکیں اِدھر سکون کی خاطر ہے مضطرب
رختِ سفر اُٹھائے، اُدھر وہ بہار ہے

(۱۶۱)

صہبائے محبّت کا جہاں جام نہیں ہے
اُس محفلِ بے لمنگ سے کچھ کام نہیں ہے

ٹھہرا ہے یہی عشق خطا کار تو اب تک
برعکس مگر حسن پہ الزام نہیں ہے

پیاسے ہیں بہت دیر سے کچھ رندِ بلانوش
کیوں جام بکف گردشِ ایّام نہیں ہے

ناکامِ تمنّا ہی نہ رہ جائیں کہیں ہم
مائل بہ کرم شاہدِ ہنگام نہیں ہے

ہر بات پہ آنکھیں مری ہو جاتی ہیں پُرنم
دل میرا ابھی در خورِ آلام نہیں ہے

ہر موج میں ساحل تو بہ ہر گام ہے منزل
کب جذبۂ دل حاملِ انعام نہیں ہے

شاکر ہیں مصائب کے تلاطم میں بھی تسکیں
کچھ فکر نہیں ہم کو جو آرام نہیں ہے

۱۶۲

ویران تیرے شہر کی اب ہر گلی لگے
ہر صبحِ زندگی تو یہاں شام سی لگے

اب شاخِ آرزو بھی یہاں زرد سی لگے
محرومِ کیفِ کم مری یہ زندگی لگے

برگشتگیٔ بخت کا عالم نہ پوچھیے
ہر شخص اِس جہاں کا مجھے اجنبی لگے

تا عمر غم سے پا نہ سکا آدمی نجات
کتنی عجیب اس کی بھی یہ بے بسی لگے

اُمید و آرزو ہی کا جب کارواں نہیں
پھر ظلمتوں میں کیوں نہ گھِری زندگی لگے

فصلِ بہار دور تک آئے نہ جب نظر
کیوں وادیٔ حیات نہ پُرخار سی لگے

بربادِ آرزو جو ہیں کیوں چھیڑیئے اُنہیں
اچھّی بھی کوئی بات انہیں کب بھلی لگے

تاریکیوں کا جیسے ہوا ہے جہاں شکار
معدوم یوں نظر میں یہاں روشنی لگے

محرومیاں ہی جبکہ مقدّر بنی رہیں
پھر زندگی سے دور نہ کیوں زندگی لگے

★

FORWARDED
FROM
GOVERNMENT OF INDIA

نظمیں

نذرِ عقیدت بنام گاندھی جی
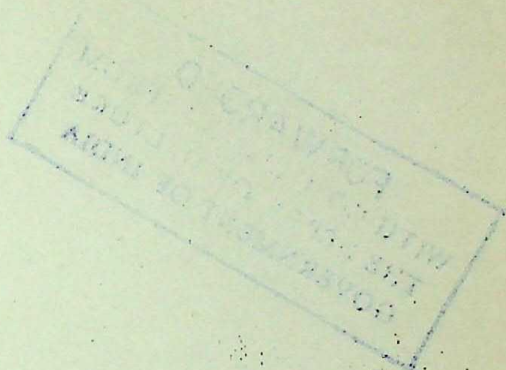
نچھاور جس نے کی ہو زندگی اپنی، اصولوں پر
چمن میں جس کا تھا احسان کانٹوں اور پھولوں پر
اُسے تسلیم کہتے ہیں، اُسے پرنام کرتے ہیں

دکھایا جس نے ہو دیپک اندھیرے میں زمانے کو
بتایا جس نے چلنے کو اجالے میں زمانے کو
اُسے تسلیم کہتے ہیں، اُسے پرنام کرتے ہیں

مٹائی جس نے ہستی بس وطن کی شان و عظمت پر
فقط توڑا ہو دم جس نے وطن والوں کی خدمت پر
اُسے تسلیم کہتے ہیں، اُسے پرنام کرتے ہیں

زمینِ ہند پر ہوتا ہو جس کے نام کا چرچا
بجایا جا رہا ہو آج جس کے نام کا ڈنکا
اُسے تسلیم کہتے ہیں، اُسے پرنام کرتے ہیں

وہ جس نے فتح کا جھنڈا لگایا ہو ہمالے پر
چڑھایا جس نے ہو مالا وطن ہی کے شوالے پر
اُسے تسلیم کہتے ہیں، اُسے پرنام کرتے ہیں

بھلائی جا نہیں سکتی ہو جس کی یاد اَے تسکیںؔ
مٹائی جا نہیں سکتی ہو جس کی یاد اَے تسکیںؔ
اُسے تسلیم کہتے ہیں، اُسے پرنام کرتے ہیں
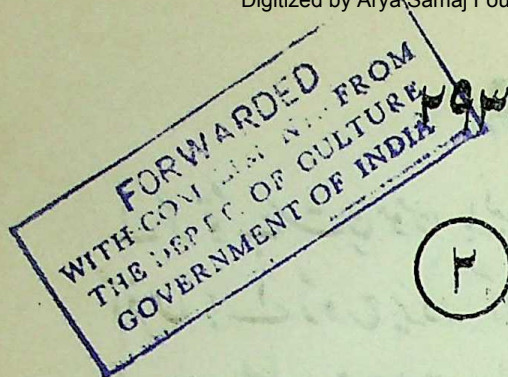
علّامہ اقبالؒ

تیرۂ و تاریک ہے کُل کائنات
سونی سونی ہے مری بزمِ حیات
مادرِ گیتی کا تھا اِک آفتاب
تھا جہاں میں آپ ہی اپنا جواب
ناخدائے کشتیٔ ایماں تھا اِک
رہنمائے قوم تھا، اِنساں تھا اِک

ہے وہ سرچشمہ، نہیں جس کا سراغ
ہے رہینِ فیض تو، اُردو کا باغ
تجھ سے حاصل ہے حیاتِ سرمدی
رُوحِ اِنساں کو دیا درسِ خودی

اَے کہ تُو ہے شانِ مومن بالیقیں
آفریں! اَے رُوح پرور آفریں
تجھ سے حاصل ہے حیاتِ جاوداں
رُونما ہے انقلابِ بے اماں!

تجھ پہ نازاں ہے یہ انساں بے گماں
تجھ سے پاتا ہے نشانِ لا مکاں
جزوِ ایماں ہے ترا اِک اِک کلام
دے رہا ہے کب سے تو ہم کو پیام

آئینہ دارِ حقیقت لے سلام!
رازدارِ نورِ وحدت لے سلام!
جانِ مِلّت، رُوحِ الفت لے سلام!
باعثِ تسکین و راحت لے سلام!

اِشارے

رہروانِ راہِ حق کے ساتھ چل سکتا نہیں
عزمِ نَو کے واسطے فطرت بدل سکتا نہیں
چار عنصر کے شکنجے سے نِکل سکتا نہیں
میں اُلجھ کر زیست سے بھی جب بہل سکتا نہیں
پھر تو میدانِ عمل میں، ہر عمل بے سود ہے!

فطرتِ رنگیں میں رنگِ انقلابی ہے محال
قوّتِ فکرِ رسا کی دستیابی ہے محال
رزم گاہِ زیست میں جب فتحیابی ہے محال
زندگی کی دَوڑ میں جب کامیابی ہے محال
پھر تو میدانِ عمل میں، ہر عمل بے سود ہے!

وقت کا سیلاب اُمڈا ہے میں بہہ سکتا نہیں
جو گذرتی ہے مرے دل پر وہ کہہ سکتا نہیں
ظلم مُنعم کا میں اک لمحہ بھی سہہ سکتا نہیں
بے پلائے خون اپنا جب میں رہ سکتا نہیں
پھر تو میدانِ عمل میں ہر عمل بے سود ہے!

میں وطن کا ہوں جواں اور شان ہے عصمت دری
میرے ہر کرتوت سے ظاہر ہے میری خود سری
ہو کے بھی آزاد جب کرتا نہیں میں سروری
پاپ سے شاخِ تمنّا جب نہیں ہوتی ہری
پھر تو میدانِ عمل میں ہر عمل بے سود ہے!

ترکِ رسم و راہ اُن سے ہائے کر سکتا نہیں
اُن کے چرنوں پر میں سر رکھ کر بھی مر سکتا نہیں
جھوٹے وعدوں سے مرا جب پیٹ بھر سکتا نہیں
جب مرے سینے میں خنجر بھی اُتر سکتا نہیں
پھر تو میدانِ عمل میں ہر عمل بے سود ہے! ★

انکشاف

شکوہ کرنا نہیں مقصود ہے، لیکن اے دوست
باتوں باتوں میں نکل آئی ہے اِک بات ابھی
طَور تو طَور ہیں، تیور نہ بدلتا اَے کاش
یوں نہ دیتا مرے جذبات کو صدمات ابھی

تیرے ہر غم میں رہا میں بھی برابر کا شریک
پھر بھی دل میں نہ ترے میں نے کیا گھر اے دوست!
جامِ امرت کے عوض ساغرِ زہراب ملا
تا بکے لاؤں نہ شکوہ میں زباں پہ اَے دوست!

نام جمہور کا قائم ہے ہمارے دم سے
تجھ کو لیکن نہ رہا کچھ بھی لگاؤ ہم سے
تخمِ الفت سے خصومت ہی کے بوٹے نکلے
پھول کھلتے ہیں انوکھے یہاں چشمِ نم سے

ہم نہیں ڈرتے کبھی دار و رسن سے لیکن!
جان کب ہوتی ہے بڑھ کر بھی وطن سے لیکن!
دردِ شہریانوں میں پھرتے ہیں لئے قوم کا غم!
ہے غرض ہم کو فقط ایسی لگن سے لیکن!

تاریکیاں

اندھیرے بھی ہیں مانندِ گورِ ولحد کے
زمانے میں ایسی ہیں تاریکیاں کیوں
لئے ہم نے ناخن تو ہوش و خرد کے
سمجھ میں نہ آئیں یہ باریکیاں کیوں

ابھی اور کچھ دن اے تخئیلِ شاعر
فسردہ زمانے کی حالت رہے گی!
تجھے کیا کہیں ہم اے پر بستہ طائر
ابھی دُور تجھ سے تو رفعت رہے گی!

یہ مانا تری کوششیں ہیں مٹانا
زمانے سے یکلخت رسمِ کہن کو
یہ مانا ترا عزم ہے والہانہ
مگر باندھ لے پہلے سر سے کفن کو!

جو آجائے حق آج باطل پہ غالب
چراغِ ستم پھر ہو گُل فی الحقیقت!
جو ادراک ہو جہلِ جاہل پہ غالب
تو افشا ہو پھر سارا جُل فی الحقیقت

تو اے کاش بدلے زمانے کی فطرت
ضلالت ہو گُم پھر تو نورِ سحر ہیں!
ابھی کِشتِ حسرت بنے باغِ جنت
کِھلیں پھول پر پھول سوکھے شجر میں!

بنا دے جہاں کو تو گلزارِ تسکیں
ترے ہاتھ میں جبکہ ہے سرخ پرچم!
بدل دے تو گفتار و کردار تسکیں
کرے گا تو کب تک زمانے کا ماتم!

(۶)

ہلالِ عید

مبارک! اے ہلالِ عید تیرا رونما ہونا
مبارک! تیرا چرچا ہر زباں پر جابجا ہونا
مبارک! اے ہلالِ عید تیرا باوفا ہونا
کلیدِ بابِ عشرت ہے ترا جلوہ نما ہونا

ہلالِ عید بن کر تو پیامِ دید لایا ہے
وصالِ یار کا سودا مرے سر میں سمایا ہے

ہلالِ عید، تو بھی تو عجب معشوقِ پُرفن ہے!
ہویدا تو فلک پر ہے، دلِ عشاق مسکن ہے!
ترا شیدا، ترا عاشق ہر اک شیخ و برہمن ہے!
تری رویت سے ہر اہلِ یقیں کا قلب روشن ہے!

تری رویت سے ہر دل میں اجالا ہی اجالا ہے
کدورت دور ہے دل سے خوشی کا بول بالا ہے

ہلالِ عید ہے، یا ابروئے خمدارِ قاتل ہے!
سفینہ اپنے ارماں کا رواں سوئے ساحل ہے!
کلیدِ میکدہ ہے اور نشانِ راہِ منزل ہے!
کسی پامالِ حسرت کا تو شاید پارۂ دل ہے!

خوشا قسمت! مئے عرفاں کا لب تک جام آیا ہے
کنول دل کا کھلے جس سے وہ عنواں ہم نے پایا ہے

فضا ہے کیف آگیں، بادۂ سرجوش لا ساقی!
درِ میخانہ مدت پر ہوا ہے آج وا ساقی!
تری آنکھوں کے صدقے آج تو کھل کر پلا ساقی!
کہ تسکیں آج پینے کو ہے بیٹھا برملا ساقی!

تصور یوں ترا دل میں ہلالِ عید آیا ہے!
کسی قاتل کو جیسے ہم نے سینے سے لگایا ہے!

★

(۷)

فردوسِ نظر

خلد سے آج بہاروں کا سلام آیا ہے!
ہفت افلاک سے تاروں کا سلام آیا ہے!
کیف زا مست نظاروں کا سلام آیا ہے!
کیا مرے نام بھی آج اُن کا پیام آیا ہے؟
کیا یہ سچ ہے کہ مسرّت کا مقام آیا ہے؟

ہاں! مداوائے الم جشنِ بہاراں تو نہیں!
ہاں! مرے دردِ جگر کا کوئی درماں تو نہیں!
ہاں! تری چشمِ کرم کیف کا عنواں تو نہیں!
پھر بھی کیوں ذکر ترا لب پہ مدام آیا ہے؟
کیا مرے دل کو ترے دل کا سلام آیا ہے.

زخمِ دل تو ہے یہاں، زخم کا مرہم ہی نہیں!
سب ہے دنیا میں، علاجِ غمِ آدم ہی نہیں!
شمعِ غم کا جو عطیہ ہے، وہ مدّھم ہی نہیں!
ایک میرے ہی لئے غم کا پیام آیا ہے!
ہائے! گردش میں بھی کس طرح یہ جام آیا ہے!

شرکتِ جشنِ بہاراں میں کروں، یا نہ کروں؟
اے غمِ دل، غمِ جاناں میں کروں، یا نہ کروں؟
نذرِ وحشت ابھی داماں میں کروں، یا نہ کروں؟
جانے کس موڑ پہ اپنا بھی مقام آیا ہے؟
صبح کے ساتھ یہ کیوں شام کا نام آیا ہے؟

بربریت

کس کا شکوہ کریں، کس کا ماتم کریں، ایک ہی غم اگر ہو تو پیہم کریں
کیوں نہ سوچیں مداوائے رنج و الم، تا بکے اپنی آنکھوں کو پُرنم کریں

اِک طرف ہے ستم کوش حیوانیت، اِک طرف چُپ لگائے ہے انسانیت
زندگی زندگی سے ہے بیزار حیف، کیوں چراغِ ستم پھر نہ گُل ہم کریں

ایسے جینے سے مرنا ہے بہتر کہیں، جس میں باقی رمق زندگی کی نہیں
ہاں پسینہ اجل کو بھی آنے لگے، اپنے جینے کا ساماں اگر ہم کریں

ہے خودی سے ہمیں ایسی بیگانگی، جیسے نسبت بھی اس سے نہیں دور کی
جشن کہتے ہیں جس کو وہی جشن ہو، خونِ دل سے چراغاں اگر ہم کریں

برہمی زلفِ گیتی کی ایسی نہ تھی، دلکشی کتنی رکھتی تھی پہلے یہی
قدر و قیمت اگر اس کی ہم جانتیں، فرض مشّاطگی کا ادا ہم کریں

میکدے میں وہ زندہ دلی اب نہیں، جام و مینا میں وہ دلکشی اب نہیں
بحرِ آلام میں کب سے ہیں غوطہ زن، امر مشکل ہے کیونکر غلط غم کریں

رکھ لیا ہے جگر پر جو سنگِ گراں، حرفِ شکوہ ہے لب پر نہ آہ و فغاں
چپ ہیں شاکر مصائب کے طوفان میں، حادثاتِ الم کیوں بیاں ہم کریں!

بربریّت کا سرگرم ہے کارواں اور بہتی ہیں اب خون کی ندّیاں
ہر طرف ہے کفن پوش انسانیت، کیوں نہ ہم اس پہ پیشکین ماتم کریں

★

(۹)

طنزِ مسلسل

نہیں کرتا میں لفّاظی، حقیقت ہی حقیقت ہے
زبانِ شرق سے نفرت نہ کچھ انگلش سے رغبت ہے

سمجھنا آج عالِم کو بھی عالِم کیا جہالت ہے
خدا کا شکر ہے تعلیمِ انگریزی غنیمت ہے

رہا جب تک فقط 'عالِم' میں جاہل سے بھی بدتر تھا!
بھلا ہو تیرا اَے انگلش، کہ حاصل تجھ سے عزت ہے

میں سب کچھ تھا سہی، لیکن تھا انگریزی سے بے بہرہ
سمجھ میں آ گیا نکتہ کہ انگلش کی ضرورت ہے

کسی صورت جو میں نے کر لیا یہ مرحلہ بھی طے
تو بس عزت ہی عزت ہے لگی قدموں سے دولت ہے

ہوئی کایا پلٹ ایسی کہ جو تھا قابلِ نفریں
وہی ہے آج مستحسن، وہی بس نیک طینت ہے

لئے پیغام آئے اور گئے کتنے ہی سُن سُن کر

سُنا مجھ کو جو یہ کہتے کہ 'زر' سے مجھ کو نسبت ہے

یہاں تو فاقہ مستی اور غالب تنگدستی تھی!

تو پھر کیوں کر نہ میں کہتا 'تِلک' کی مجھکو حاجت ہے

ہوا شہرہ کچھ ایسا اپنی ڈگری کا زمانے میں

کہ آخر ہو گئی شادی مری 'زر' سے یہ حیرت ہے

گھٹا ساون کی ہے یا ہے کسی کی موہنی صورت

نظر پڑتے ہی 'خانم' پر میسر مجھ کو فرحت ہے

کروں کیوں کر نہ اُس کی قدر جیتے جی میں اے تسکیںؔ

کہ جس کے دم سے عزت اور حاصل کبر و نخوت ہے

★

۱۰

پیسہ

پیسہ فقط یہاں ہے کوئی دوسرا نہیں
ساری خدائی اس کی ہے لیکن خدا نہیں

کرنے کو یوں تو کرتے ہیں پوجا بھی اس کی لوگ
آئینِ زندگی ہیں یہ لیکن رَوا نہیں

سُکھ چین سب ہے پیسہ، یہ پیسہ ہے آبرو
انسان وہ نہیں ہے جو پلّے ٹکا نہیں

تُو ہے جہاں کا شاہدِ رعنا بنا ہُوا!
اے شعلہ رُو ہے کون جو تجھ پر فدا نہیں

سایۂ فلک ہے پل میں تو پل میں ہے دولہ دولہ
دیکھا ہے تجھ سا ہم نے کوئی کج ادا نہیں

تیرے بغیر چہرے کا ہوتا ہے رنگ فق
ورنہ ہے بات کون سی اب تک پتا نہیں

شہرہ ہے اس جہان میں تیرا ہی ماہرو
لیکن یہ فیض تیرا تو بہرِ گدا نہیں

وجہِ نشاط و عیش ہے، تیرا وجود بھی
تجھ سے جدا رہا تو وہ غم سے جدا نہیں

بے مائگی کا کرتے ہو پھر کس لئے گلہ
تسکین جبکہ اس سے تمہیں واسطہ نہیں

سِنیما

مؤذن نے اذاں دی اور بھاگے مثلِ شیطاں ہم
سنیما گیٹ پر پہنچے، تو پہنچے مثلِ حیواں ہم

ٹکٹ لے کر اندھیرے ہال میں اُلّو سا جا بیٹھے
جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا پلاٹِ عشقِ پیچاں ہم

اُدھر تو نغمۂ نرگس سے سارا ہال گونج اُٹھا!
اِدھر بچّے کے رونے سے ہوئے بیحد پریشاں ہم

اُدھر پردے پہ ہیروئن سے ہیرو نے جتایا عشق
اِدھر کرتے ہیں خلوت جان کر اُلفت کا ساماں ہم

اُدھر ہیرو سے ہیروئن نے پردے پر کئے وعدے
اِدھر یہ لطف کرتے ہیں کسی سے عہد و پیماں ہم

"سینما ہال" ہے یا ہے "کرپشن" کا بڑا مرکز
بچایا لاکھ لیکن کھو ہی بیٹھے زُہد و ایماں ہم!

دُعائیں دے رہے ہیں انقلاب دہر کو تسکیں!
کسی مہ وش کی "بلڈنگ" میں ہوئے ہیں آج مہماں ہم!

(۱۲)
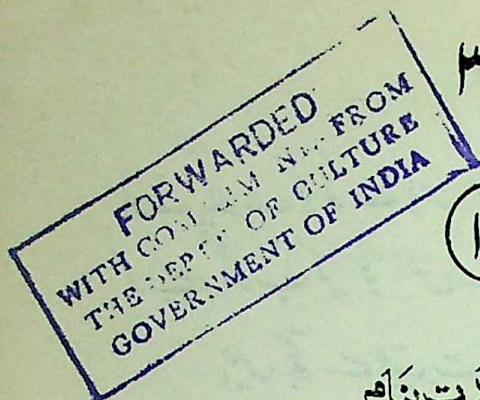
نذرِ عقیدت بنام

رابندر ناتھ ٹیگور

تری خدمت میں ہم بھی لائے ہیں جذبات کے ٹکڑے
تجلّی ان کی کرڈالے عجب کیا رات کے ٹکڑے
ہمیں تجھ سے عقیدت ہے، سلامِ شوق کہتے ہیں

ادب کی محفلوں میں تیری عظمت آج روشن ہے
حقیقت پھر حقیقت ہے، حقیقت آج روشن ہے
ہمیں تجھ سے عقیدت ہے، سلامِ شوق کہتے ہیں

ترا انداز رندانہ، ترا اسلوب شاہانہ
زمانے کے لئے باتیں ہوئیں تیری حکیمانہ
ہمیں تجھ سے عقیدت ہے، سلامِ شوق کہتے ہیں

اَدب پارے کو تُو نے اِس طرح سانچے میں ڈھالے ہیں
کہ جیسے ڈوب کر غوّاص نے موتی نکالے ہیں
ہمیں تجھ سے عقیدت ہے، سلامِ شوق کہتے ہیں

اَمِٹ ہے کارنامہ بھی ترا اَے رہبرِ منزل!
مٹائے مِٹ نہیں سکتا، اگر کوشش کرے باطل
ہمیں تجھ سے عقیدت ہے، سلامِ شوق کہتے ہیں

اَدب کے آسماں پر تو مثالِ مہرِ تاباں ہے
چمن زارِ ادب میں تو بہارِ کیف ساماں ہے
ہمیں تجھ سے عقیدت ہے، سلامِ شوق کہتے ہیں

حقیقت آشنا دل کو بھی تجھ سے کیوں نہ ہو نسبت
حقیقت بیں نگاہوں میں بھی تیری کیوں نہ ہو عزّت
ہمیں تجھ سے عقیدت ہے، سلامِ شوق کہتے ہیں

گوہرِ اشک

[نظم - بوقتِ رخصت شری اے - کے پرشاد - ڈویژنل اکاونٹس افسر - دانا پور]

برنگِ موسمِ گُل ہے ہمارا یہ افسر
جُدائی اِس کی بنی باعثِ دلِ مضطر

رہے گی ذہن میں اب تیری یاد کی خوشبو
نہ بھول پائیں گے ہم تجھ کو پیکرِ خوشخو!

ترے وجود سے قائم تھی ہر طرف رونق!
ہوئے ہیں لالہ و گل کے بھی آج چہرے فق

بہار، گلشنِ دفتر سے آج رخصت ہے
گلوں کے سر سے محبت کا تاج رخصت ہے

خدا کرے کہ وہی دورِ نو بہار آئے
مرے چمن میں جو آئے وہ غمگسار آئے

میں ڈر رہا ہوں اندھیروں کے نام سے ہمدم!
بدل نہ جائے کہیں صبح شام سے ہمدم!

ہمارے سامنے پھر آفتابِ نو آئے
نظر میں آئے تو پھر انتخابِ نو آئے

ہمارے حسنِ عقیدت کا ہے کنول روشن
جلا ہے دل تو وہیں دل کا ہے محل روشن

مری نظر میں جو لرزاں ہیں اشک کے گوہر
میں کر رہا ہوں انہیں پیش تجھ کو اے افسر

(۱۴)

بیزاری

اے فریبِ حسین تیری خاطر مجھے رنج سہنا پڑا، دُکھ اٹھانا پڑا
آئینہ دل کا مَیلا نہ ہونے دیا، زخم کھا کھا کے بھی مسکرانا پڑا

کتنی دشواریوں سے گذر کر مجھے، غیر ممکن کو ممکن بنانا پڑا
وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے، تیری باتوں پہ ایمان لانا پڑا

اے غمِ عشق تیرا ہی سودا نہیں، مجھ کو پاسِ غمِ زلفِ گیتی بھی ہے
داغ بخشے ہیں تُو نے ہی مجھ کو نہیں، ظلمتِ شب کا چرکا بھی کھانا پڑا

کیا کروں اپنی بیچارگی کو بیاں، میرے ہاتھوں سے دامن خودی کا چُھٹا
بات وہ جو خودی کو گوارا نہ تھی، اُس کی تسلیم کو سر جُھکانا پڑا

رہگذارِ الم تنگ و تاریک تھی، کام ہمت کا تھا اُس میں رکھنا قدم
بجھ چکے تھے چراغِ عزائم مگر خونِ دل سے اُنہیں پھر جلانا پڑا

نا بچے اور بنتا نشیمن مرا، بجلیوں کا نشانہ سرِ گلستاں
بجلیاں جس سے خود مانگتی ہوں اماں آشیاں ایسا مجھکو بنانا پڑا

یوں تو سہتا رہا میں ستم پر ستم، حرفِ شکوہ لبوں پر نہ آیا کبھی
وقت نے زخم کتنے کئے مندمل، وقت کے سامنے سر جھکانا پڑا

انجمن میں تری اب وہ باتیں نہیں، دلکشی وہ نہیں، بانکپن وہ نہیں
دیکھ کر بدلی بدلی روِش ساقیا، اپنے احساس کو پھر جگانا پڑا

عمر روتے ہی روتے مری کٹ گئی، چین پایا نہ پل بھر بھی نامِ خدا
حال پوچھا کسی نے جو تسکیں مرا، چپکے چپکے اجل کو بلانا پڑا

انقلاب

انقلاب آنے کو آتا نہیں دنیا میں کہاں
منتشر ایسے تو ہوتے نہیں اوراقِ جہاں
عزم و احساس تو کھاتے ہی ہیں پیہم ٹھوکر
روح اِس طرح کبھی ہوتی نہیں نالہ کناں!

آندھیاں راہ میں اُٹھتی ہیں تعصّب کی مگر
بجھتے دیکھے نہیں اِس طرح محبّت کے چراغ
کشت و خوں ایک ہی منزل پہ ہوا کرتے ہیں
پھرتے دیکھے نہیں اِس طرح تو انساں کے دماغ

حرف آیا تھا کبھی اِس سے بھی پہلے اِس پر
لٹتے اس طرح تو دیکھا نہیں ناموسِ وطن!
صورتِ حال بگڑتے تو بہت دیکھی ہے
بگڑے دیکھے نہیں اِس طرح تو انساں کے چلن!

ندّیاں خون کی جاری تو ہوئی ہیں اکثر
خوں برستے نہیں دیکھے ہیں کبھی ہم نے مگر!
بربریّت کے شجر سینچے ہیں جب سے لشکیں
پھول کھلنے لگے گلشن میں باندازِ دگر!

FORWARDED
FROM
GOVERNMENT OF INDIA

قطعات
و
رباعیات

قطعات

قطعہ (١)
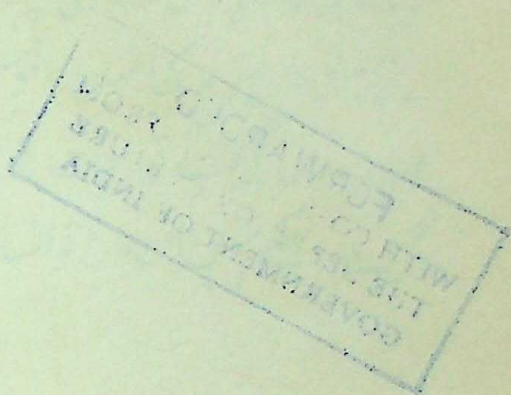
گُل بھی آنکھوں میں خار سا کیوں ہے؟
اُن کا ملنا بھی بار سا کیوں ہے؟
میری دُنیا بدل گئی شاید!
دل یہ اُجڑا دیار سا کیوں ہے؟

قطعہ (٢)

آہ! کیا انقلاب آیا ہے!
کہ یہ گویا عذاب آیا ہے!
دیکھئے حشر اور کیا ہو گا!
ظلم اب بے نقاب آیا ہے!

قطعہ (۳)

اشک آنکھوں سے کیا ٹپکتا ہے!
چشمۂ آتشیں ابلتا ہے!
کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوا تسکیں!
زخم خوردہ ہے دل مچلتا ہے

قطعہ (۴)

ایسی آزادی ملی کہ ہو گئے وحشی سبھی!
جابجا اب ملک میں ہے قتل و خوں غارتگری
سو گیا "کلچر" یہاں کا، مر گئی انسانیت
راہ پر بھی کر رہے ہیں کھا کے اب تو ترقی

قطعہ (۵)

انقلاب آیا ہے یا رب کہ عتاب آیا ہے
اک نیا ہند کی تاریخ میں باب آیا ہے
دیکھئے حشر ہے اب اور ابھی کیا کیا ہوگا
اپنے افعال کا ہم پر یہ عذاب آیا ہے

قطعہ (۶)

مجھ سے پوچھے نہ کوئی میں نے بھی کیا کیا دیکھا
جس طرف اٹھی نظر حسن کا دریا دیکھا
تابکے رہتا وہ جلوہ پس پردہ تسکین
میں نے ہر شکل میں اس کو تو ہر اک جا دیکھا

قطعہ (۷)

جس پہ نازاں تھی آدمیت کل
آج وہ آدمی نہیں ملتا!
یہ بھی سچ ہی اک حقیقت ہے
جس کو ڈھونڈو وہی نہیں ملتا!

قطعہ (۸)

اک ذرا اپنی نظر مجھ سے ملا تو ساقی!
تیرے شیشے میں جو پیتا ہے پلا تو ساقی!
مرد بیگانہ ہو دنیا سے دنی سے مطلق
بیخودی کی وہ مجھے راہ دکھا تو ساقی!

قطعہ ۹

اُن کا وعدہ ہے کہ کل اُن کی زیارت ہوگی!
ہم نہ کہتے تھے کہ دلوں پہ ایسی بھی عنایت ہوگی!
وصلِ دشمن نہ کہیے، اُسے مقتل کہیے
پردہ اُٹھتے ہی جہاں اپنی شہادت ہوگی!

قطعہ ۱۰

کس سے کہیے کہ سنے کون فسانہ میرا
جب کہ دشمن ہے زمانے کا زمانہ میرا
شاخِ گل پر تھا نشیمن کبھی اپنا ہمدم
اب تو خاروں سے ہے وابستہ ٹھکانہ میرا

☆

رُباعیات

رُباعی

۱

زندگی شامِ الم ہی میں کٹی ہے اب تک!
اپنی رُوداد کسی سے نہ کہی ہے اب تک!
کس سے کہیئے بھی اسے کون ہے مونس ایسا
جس سے تسکین کو تسکین ملی ہے اب تک!

رُباعی

۲

ہم نے آغوشِ اذیت ہی میں پلنا سیکھا!
شمعِ سوزاں کی طرح دہر میں جلنا سیکھا!
صبحِ عشرت نہ سہی، شامِ مصیبت ہی سہی
وادیٔ غم میں بہر رنگ بہلنا سیکھا!

رُباعی

(۳)

شاعر کا ہر اک شعر سمجھ کر دیکھو
جو فکر کے سانچے میں ہے پیکر دیکھو
واقف نہیں جوہر سے تم اُس کے شاید!
ہوتا ہے یہ مرہم، کبھی نشتر دیکھو

رُباعی

(۴)

ہم نے کیا کیا نہ زمانے کو بدلتے دیکھا
سُرخیٔ شام کو بھی صبح میں پلتے دیکھا
سب تو سب ہے یہی اک وجۂ تحیّر تسکیں
ساغرِ غم میں ہر اک شوق کو ڈھلتے دیکھا

رُباعی ۵

پھیلا ہوا ہے یہ اندھیرا ہی اندھیرا ساقی
کوچ تا چند کرے گا نہ یہ ڈیرا ساقی
منتظر صبح گلستاں کی ہیں کب سے یہ آنکھیں!
اب تو بکھر جائے نگاہوں میں سویرا ساقی

رُباعی ۶

کیوں نہ اندازِ نظر اپنا بدل کر دیکھو!
کیوں نہ ہم ظرفِ سحر خیز میں ڈھل کر دیکھو!
کیا عجب صبحِ چمن پر ہو تمہارا قبضہ
حلقۂ دامِ خرد سے تو نکل کر دیکھو!

رباعی (۸)

ہم نہ ہوتے نہ یہ دنیا کا فسانہ ہوتا
زلفِ خوباں نہ سرِ یہیں عشق کا شانہ نہ ہوتا
کاش ہوتے نہ جلا اصولیت شبنم تجھ سے
بے سرِ دنگارہ ہیں اپنا بھی ٹھکانا ہوتا

رباعی (۷)

رنگِ لب و رخسار بدل جاتا ہے
ہاں اب حسن کا معیار بدل جاتا ہے
سب کچھ ہے تقاضائے نظامِ فطرت
ہے نکہتِ گلزار بدل جاتا ہے

رُباعی

(۹)

پوچھنے والے نہ سُن مجھ سے کہانی میری!
آج بے کیف ہے پُر کیف جوانی میری
ضامنِ زیست کبھی اپنی تھی بادہ نوشی
روکشِ زیست ہے اب تشنہ دہانی میری

رُباعی

(۱۰)

ہر آن یہ ہوتا ہے توہّم جیسے!
چھُوٹا کسی بربط سے ترنّم جیسے!
اللہ رے اُس شیریں دہن کا لہجہ
رس گھول دے کانوں میں تکلّم جیسے!

رُباعی (۱۳)

اشکِ سرِ مژگاں ہے نظارا دلکش
تاریکیِ فرقت کا سہارا دلکش
پُر کیف ہوئی جاتی ہے شامِ غم بھی
آتا ہے نظر ایک ستارا دلکش

رُباعی (۱۴)

چلنا ہے تو چلنے کا قرینہ سیکھو!
موجوں سے بھی ٹکرانا سفینہ سیکھو!
ساحل ابھی قدموں میں تمہارے آئے
پہلے تہِ گرداب تو جینا سیکھو!

رُباعی (۱۵)

دل میرا مرکزِ آلام رہے گا کب تک!
ناوکِ دہر سے بھی کام رہے گا کب تک!
اب تو اے گردشِ ایّام بتا دے مجھ کو
آتشِ ہجر پہ یہ انعام رہے گا کب تک!

رُباعی (۱۶)

شمعِ الفت تو ہر اک دل میں جلا کر دیکھو
غیر کو بھی تو کبھی اپنا بنا کر دیکھو
کیا عجب نور سے معمور ہو ساری خلقت
تاج تو اپنے عزائم کو پھینک کر دیکھو

رُباعی

(۱۷)

ہے ریزہ ہر گل کی کہانی ساقی!
مخمور ہے گلشن کی جوانی ساقی!
ہو سکے تو تمہیں مل حیاتِ گل ہو!
ہم سے وہ ہے تمہیں لافانی ساقی!

رُباعی

(۱۸)

پھر دورۂ زمیں پہ اُبھرا ہے جمالِ رنگیں!
جس کی دنیا میں نہیں کوئی مثالِ رنگیں!
پُر آنے پُر آنے ہوئے دامانِ تخیل تسکیں
اللہ اللہ رے یہ عکسِ جمالِ رنگیں!

رُباعی (۱۹)

زندگی ظلم کے نرغے میں رہے گی کب تک!
سختیاں جورِ مسلسل کی سہے گی کب تک!
ہمسرِ مرگ ہے یہ زندگی اب تو ہمدم
ہائے! اندوہ و الم بھی نہ کہے گی کب تک!

رُباعی (۲۰)

زندگی صورتِ شبنم ہی رہی ہے اب تک!
ان سے اُمیدِ کرم ہی رہی ہے اب تک!
کوئی اُمید کروں ان سے میں کیوں کر تسکیں
اپنی قسمت بھی تو برہم ہی رہی ہے اب تک!

رُباعی (۲۱)

رسوا دلِ مضطر کو بھی کرنا کیسا!
سے بے موت زمانے میں بھی مرنا کیسا!
چلتی ہے چلے بادِ مخالف ہمدم!
برحق ہے اگر موت تو ڈرنا کیسا!

رُباعی (۲۲)

دل موردِ الزام ہوا جاتا ہے!
ہاں! مفت میں بدنام ہوا جاتا ہے!
اے جذبۂ دل! تجھ کو بھی دیکھا ہم نے
ہر کام میں ناکام ہوا جاتا ہے!

رُباعی (۳۳)

آئے جو سحر، شام نہ آئے ساقی!
رنج و غم و آلام نہ آئے ساقی!
بدلے تو کچھ اس طرح زمانہ بدلے
رونے کا کبھی نام نہ آئے ساقی!

رُباعی (۳۴)

زندگی عہدِ گزشتہ کو بھی روئے کتاب!
دامنِ خشک کو اشکوں سے بھگوئے کتاب!
چند بیتے ہوئے لمحات کے رنگیں منظر
اپنی یادوں کے دریچے میں سموئے کتاب!

رُباعی (۲۵)

زندگی یاس بداماں ہی رہی ہے اب تک
ہر خوشی ہم سے گریزاں ہی رہی ہے اب تک!
تابکے گردشِ قسمت کا بھی رونا تسکیں
زندگی مرکزِ طوفاں ہی رہی ہے اب تک!

رُباعی (۲۶)

اپنے ناموس پہ ہم حرف نہ آنے دیں گے!
جان جاتی ہے عزّت تو نہ جانے دیں گے!
توڑتے بادِ ستم ہم کو بھی سمجھا کیا ہے
شمعِ عظمت تو کبھی ہم نہ بجھانے دیں گے!

رباعی (۲۷)

تختۂ دار کو جب جنونِ شیدا سمجھا!
اپنے ہر غم کا اُسے سہرا تو مداوا سمجھا!
سیماب نے دی جان تو ہستی سے بھی تو فنی کی خاطر
اے غمِ وقت ترا ہم نے تقاضا سمجھا!

رباعی (۲۸)

آج مکمل آگئی ہستیاں نے سے تو یہ میری!
جب کا دستور تھا، وہی جاتی رہی یہ دنیا میری!
اب غم مجھ پہ ہوا ایسا مسلط تسکین
ایسے میں بیٹھا ہوں کہ دنیا تہ و بالا میری!

رُباعی (٢٩)

اب مرے غم کا بھی کیا خاک مداوا ہوگا!
اب یہ سرسبز بھی کیا نخلِ تمنّا ہوگا!
کب تلک دل کو رہے ایسی امیدِ موہوم
مجھ کو منظور جو ہے، وہ تو خدایا ہوگا!

رُباعی (٣٠)

بدلا بھی تو کچھ ایسا زمانۂ عالم
ایک محور پہ نہیں اپنا ٹھکانۂ عالم
کروٹ پہ اگر پھر ہو زمانہ مائل
مُٹّھی میں ہو راحت کا خزانۂ عالم

رباعی (۴۱)

سایے میں تغافل کے بہلنا مشکل
لپٹے پہ تعقل کے بھی چلنا مشکل
رہنا ہے جو دنیا میں تو رہنا سیکھو
ہو جائے نہ دلدل سے نکلنا مشکل

رباعی (۴۲)

غم وادی پرخار میں چلنا سیکھو
پہنچے ہوئے صحرا میں بہلنا سیکھو
منزل کی طلب ہے تو ہے آگے منزل
ہاں اظرف ادا یاضیت میں تو ڈھلنا سیکھو

رُباعی (٣٣)

مائل بہ تغیّر ہے چمن کی فطرت
دیکھی نہیں یکساں کسی گُل کی رنگت
ہے آج اگر قیدِ مصیبت دُنیا
آ جائے گی کل نظر یہی دنیا جنّت

رُباعی (٣٤)

دنیا کو بہت دیر میں سمجھا میں نے
ناحق کیا باطل کا بھروسا میں نے
غافل رہا کچھ روزِ جزا سے ایسا
مطلق نہ کیا دین کا سودا میں نے